الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

ہر آدمی اپنے گزشتہ کل کو کھو چکا ہے
کامیاب وہ ہے جو اپنے آج کو نہ کھوئے

جولائی ۱۹۸۴ء قیمت فی پرچہ — تین روپے شمارہ ۹۲

تذکیر القرآن

جلد اوّل

سورۃ فاتحہ - سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ھدیہ مجلّد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

جولائی ۱۹۸۴
شمارہ ۹۲

سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ - نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاء اللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

خرابی کی جڑ

ہر آدمی حق کا نام لیتا ہے، اس کے باوجود دنیا میں ہر طرف بگاڑ کیوں ہے۔ اس کی وجہ قرآن کے لفظوں میں الحاد (انحراف) ہے۔ یعنی بات کو صحیح رخ سے غلط رخ کی طرف موڑ دینا۔

الحاد کی ایک صورت جو موجودہ زمانہ میں بہت زیادہ رائج ہے، وہ ہے ——— انفرادی حکم کا رخ اجتماعیات کی طرف کر دینا۔ جس حکم کا خطاب آدمی کی اپنی ذات سے ہے اس کا مخاطب دوسروں کو بنا دینا۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ وربك فكبر وثيابك فطهر (اپنے رب کی بڑائی کر اور اپنے اخلاق کو پاک کر) اس آیت میں اگر وثیابك فطهر کو وثیاب غیرك فطهر (اور دوسروں کے اخلاق کو پاک کر) کے معنی میں لے لیا جائے تو سارا معاملہ الٹ جائے گا۔ جو آیت ذاتی اصلاح کا سبق دے رہی ہے وہ صرف دوسروں کے خلاف اکھاڑ پچھاڑ کے ہم معنی بن کر رہ جائے گی۔

اسی طرح تمام احکام کا حال ہے۔ ہر حکم جو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے اس کا سب سے پہلا خطاب آدمی کی اپنی ذات سے ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے انقلابی دینداروں نے تمام احکام کا رخ دوسروں کی طرف کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین و مذہب کے نام پر بے شمار ہنگاموں کے باوجود کوئی اصلاح نہیں ہوتی۔

ہر قسم کی اصلاح اور ہر قسم کے بگاڑ کا خلاصہ دو لفظ میں یہ ہے:

۱۔ خدا بڑا ہے، اس لئے میں بڑا نہیں ہوں۔

۲۔ خدا بڑا ہے، اس لئے تم بڑے نہیں ہو۔

"پہلا جملہ "اللہ اکبر" کے کلمہ کو صحیح رخ سے لینا ہے۔ اور دوسرا جملہ "اللہ اکبر" کے کلمہ کو غلط رخ سے اختیار کرنا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ "خدا بڑا ہے اس لئے میں بڑا نہیں ہوں" تو آپ کے اندر اپنی ذات کے بارہ میں ذمہ داری کا احساس جاگے گا۔ آپ کے اندر سے گھمنڈ نکلے گا اور سنجیدگی اور ذاتی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوگا۔ آپ کے اندر تواضع ابھرے گی جو تمام بھلائیوں کی جڑ ہے۔

اس کے برعکس جب آپ کا نعرہ یہ ہو کہ "خدا بڑا ہے اس لئے تم بڑے نہیں ہو" تو اس سے گھمنڈ کی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور توڑ پھوڑ اور دوسروں کے خلاف اکھیڑ پچھاڑ کی سیاست ابھرتی ہے۔ اصلاح کے نام پر ایسا فساد ظہور میں آتا ہے جو کسی حد پر رکنے والا نہ ہو۔

زندہ لوگ

قرآن کی سورہ نمبر ۱۶ میں ارشاد ہوا ہے :

ان اللہ یاھر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون (النحل ۹۰)

اللہ حکم دیتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور قرابت داروں کو دینے کا اور وہ روکتا ہے بےحیائی سے اور نامعقول کام سے اور سرکشی سے ۔ وہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

اکثم بن صفی ایک عرب تھے ۔ انھوں نے اس آیت کو سنا تو اس نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ چنانچہ وہ اپنی قوم کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ یہ پیغمبر تمام اچھے اور اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتا ہے اور کمینہ اخلاق اور اعمال سے روکتا ہے ۔ تو تم اس کو ماننے میں جلدی کرو۔ تم اس معاملہ میں سر بنو اور تم اس میں دم نہ بنو (فکونوا فی ھذا الامر رؤسا ولا تکونوا فیہ اذنابا)

جب آدمی کی فطرت زندہ ہو ، جب وہ کسی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا نہ ہو تو اس کا حال وہی ہوتا ہے جو اوپر کے واقعہ میں نظر آتا ہے ۔ وہ حق کو فوراً پہچان لیتا ہے اور اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے ۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ اور اس کے تمام لوگ اس کے دائرہ میں شامل ہو جائیں ۔

اس کے برعکس جب آدمی نے اپنی فطرت مسخ کر لی ہو ۔ جب اس کی نفسیات میں حسد اور کبر کی گرہیں پڑ گئی ہوں تو اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ سچائی اس کے سامنے آتی ہے مگر وہ اسے پہچان نہیں پاتا ۔ وہ ذاتی جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا انکار کر دیتا ہے ۔ وہ اس وقت تک نہیں مانتا جب تک کہ حالات اس کو ماننے پر مجبور نہ کر دیں ۔

حق کا ظہور آدمیوں کے لئے سخت ترین امتحان ہوتا ہے ۔ حق سامنے آنے کے بعد آدمی کے اندر دو قسم کی نفسیات جاگتی ہیں ۔ ایک حسد کی نفسیات اور دوسری اعتراف کی نفسیات ۔

حسد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ دیکھ کر جل اٹھے کہ حق کے اعلان کا کریڈٹ اس کو نہیں ملا بلکہ دوسرے کو مل گیا ۔ اعتراف کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حق کی لذت میں اتنا گم ہو کہ اس کو اپنے اور غیر کا فرق یاد نہ رہے ۔ وہ حق کو پا کر فوراً اس کی طرف دوڑ پڑے ۔ حاسد آدمی صرف پیش کرنے والے شخص کو دیکھتا ہے اور اعتراف کرنے والا اس پیغام کو جو پیش کیا گیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت حق کے مقابلہ میں ایک کا رویہ کچھ ہوتا ہے اور دوسرے کا رویہ کچھ ۔

درست کلام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اطراف عرب کے حکمرانوں کو دعوتی خطوط روانہ فرمائے تھے۔ یہ واقعہ ہجرت کے ساتویں سال پیش آیا۔ اس سلسلے میں حضرت دحیہ کلبی آپ کا مکتوب لے کر قیصر روم کی طرف گئے۔ قیصر روم اس وقت بیت المقدس میں تھا۔ اس نے جب آپ کا مکتوب پڑھا تو حکم دیا کہ عرب کے کچھ لوگ ہمارے ملک میں ہوں تو وہ یہاں حاضر کئے جائیں۔ اتفاق سے ابو سفیان اس زمانہ میں تجارت کی غرض سے اس اطراف میں گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ بلا کر دربار میں لائے گئے۔

قیصر روم نے رسول اللہ صلے اللہ کی شخصیت اور آپ کی تعلیمات کے بارہ میں بہت سے سوالات کئے جن کے جواب ابو سفیان نے دئے۔ یہ مفصل سوال وجواب سیرت کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ "جنھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے وہ عہد کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں"۔ اس کے جواب میں ابوسفیان نے کہا کہ نہیں۔ آج تک انھوں نے عہد کرکے نہیں توڑا۔ مگر آجکل ہمارے اور ان کے درمیان ایک مدت صلح ٹھہری ہے۔ نہیں معلوم کہ اس میں وہ کیا کرتے ہیں"۔

ابوسفیان کہتے ہیں کہ اس ایک بات کے سوا مجھے کوئی اور بات لگانے کا موقع نہیں ملا۔ مگر، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق، خدا کی قسم قیصر نے میری اس بات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی (فواللہ ماالتفت الیہا منی (سیرت ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۴۹۷)

قیصر نے کیوں توجہ نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بات قابل توجہ نہیں تھی۔ ابوسفیان آپ کے ماضی اور حال کے بارہ میں کوئی بات نہ نکال سکے۔ البتہ انھوں نے مستقبل کے بارہ میں ایک بات کہہ دی۔ ظاہر ہے کہ مستقبل وہ چیز ہے جو ابھی پیش نہیں آیا۔

اگر آدمی کے پاس کوئی بڑی بات کہنے کے لئے نہیں ہے تو لازم ہے کہ وہ چھوٹی بات بھی نہ کہے۔ اگر کوئی حقیقی اعتراض نہیں ہے تو فرضی اعتراض بھی نہ نکالے۔ اگر وہ قطعی دلائل سے کچھ کہنے کو نہیں پاتا تو کمزور دلائل سے بھی کچھ کہنے سے پرہیز کرے۔ اگر وہ کسی کے حال میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں پاتا تو مستقبل کی بنیاد پر اس کو مطعون نہ کرے۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ ایک شخص کو رد کرنے کے لئے ان کے پاس طاقتور دلیل موجود نہ ہو اس کے باوجود وہ بے بنیاد شوشے نکال کر اس کو مطعون کریں وہ اس طرح صرف اپنے کمینہ پن کا ثبوت دیتے ہیں۔ حقیقت کی نگاہ میں ان کی کوئی قیمت نہیں۔

۲۱واں منٹ

موجودہ دنیا میں انسان بظاہر آزاد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ اس صورت حال نے انسان کو غفلت میں ڈال دیا ہے۔ ہر آدمی بے خوف بنا ہوا ہے۔ ہر آدمی وہ سب کر ڈالنا چاہتا ہے جس کو کرنے کے لئے اس کا دل کہے۔

مگر یہ صورت حال سراسر وقتی ہے۔ آدمی کے پاس صرف ایک محدود مدت ہے۔ اس خاص مدت کے اندر ہی وہ سرکشی کر سکتا ہے۔ اس مدت کے ختم ہوتے ہی اس کا مالک اسے پکڑ لے گا۔ اس کے بعد وہ مجبور ہوگا کہ اپنی سرکشی کا انجام ابدی طور پر بھگتتا رہے۔

ہوائی جہاز کو اڑانے کے لئے دو پائلٹ ہوتے ہیں۔ ۲۱ جولائی ۱۹۸۳ کو یہ واقعہ ہوا کہ ایک ہوائی جہاز اٹلانٹک سمندر کے اوپر اڑ رہا تھا۔ عین پرواز کی حالت میں اس کے دونوں پائلٹ (ہواباز) سو گئے اور مسلسل ۲۰ منٹ تک سوتے رہے۔ وہ صرف اس وقت بیدار ہوئے جب کہ پائلٹ کیبن میں ایک خاص طرح کا الارم بجنا شروع ہو گیا۔ (ہندستان ٹائمس ۲۲ جولائی ۱۹۸۳)

یہ ہوائی جہاز کسی اتفاقی سبب سے اپنے روانگی کے مقام پر ۱۲ گھنٹے لیٹ ہو گیا تھا۔ اس غیر معمولی حادثہ کی وجہ سے پائلٹ بے حد تھکے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے ہوائی جہاز کو اڑایا تو اس کے انجن کو انھوں نے ایک خاص رفتار پر سٹ کر دیا۔ اب ہوائی جہاز ایک بندھی ہوئی رفتار پر اڑنے لگا۔ اس درمیان میں تھکے ہوئے ہوابازوں کی آنکھ بند ہو گئی۔ اور وہ مسلسل ۲۰ منٹ تک سوتے رہے۔ یہاں تک کہ کنٹرول کا نظام بگڑ گیا اور ہوائی جہاز کی رفتار غیر معمولی تیز ہو گئی۔ اس کے بعد مشینی نظام کے تحت جہاز کا مخصوص الارم بجنے لگا۔ الارم کی وجہ سے پائلٹ جاگ اٹھے اور فوراً انجن کو سنبھال لیا۔

فارن بورو (انگلینڈ) کے ہوائی جرنل (Feed–back) میں ایک ہواباز نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں یہ سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں کہ کیا کچھ ہو سکتا تھا:

I Shudder to think what could have happened

موجودہ زندگی کو اگر "۲۰" منٹ کا لمحہ فرض کریں اور اس کے بعد ۲۱ ویں منٹ کو آخرت میں داخلہ کے ہم معنی قرار دیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت نے انسان کو صرف ۲۰ منٹ تک غلطی کرنے کی اجازت دی ہے اگر وہ آخر وقت تک ہوشیار نہ ہو تو قدرت اس کو ۲۱ ویں منٹ میں غلطی کرنے کی اجازت نہ دے گی۔ ۲۰ منٹ کے بعد اس کے لئے یا تو اپنی اصلاح کر لینا ہے یا موت کی گرفتاری۔

صبر کی زمین پر

ہری بھری فصل مٹی کے کھیت میں اگتی ہے نہ کہ سونے چاندی کے فرش پر ——— یہ محدود معنوں میں صرف زراعت کی بات نہیں۔ بلکہ یہ زندگی کا عالم گیر قانون ہے۔ خدا نے ہر چیز کے وجود میں آنے کے لئے ایک نظام مقرر کر دیا ہے۔ اسی خاص نظام کے تحت وہ چیز وجود میں آتی ہے۔ کسی اور طریقہ سے ہم اس کو وجود میں نہیں لا سکتے۔

یہی انسانی زندگی کا معاملہ بھی ہے۔ زندگی ایک ایسا امتحان ہے جو صبر کی زمین پر دینا پڑتا ہے۔ زندگی ایک ایسی کھیتی ہے جو صبر کی زمین پر اگتی ہے۔ خدا نے ابدی طور پر مقرر کر دیا ہے کہ زندگی کی تعمیر صبر کی زمین پر ہو اب قیامت تک یہی ہونا ہے۔ ہم اس کی تعمیر کے لئے کوئی دوسری زمین نہیں بنا سکتے۔

صبر کسی منفی چیز کا نام نہیں وہ سراسر ایک مثبت رویہ ہے۔ صبر کا مطلب ہے ——— بے سوچے سمجھے کر گذرنے کے بجائے سوچ سمجھ کر اپنا کام کرنا۔ جذباتی ردعمل کے بجائے شعوری فیصلہ کے تحت اپنا منصوبہ بنانا۔ وقتی ناامیدیوں میں مستقبل کی امید کو دیکھ لینا۔ حالات میں گھر کر رائے قائم کرنے کے بجائے حالات سے اوپر اٹھ کر رائے قائم کرنا۔

ایک بیج کو آپ سونے کی پلیٹ میں رکھ دیں تو وہ اپنی زندگی کے سرچشموں سے مربوط نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے اسباب سے بھری ہوئی کائنات میں بے اسباب بنا ہوا پڑا رہتا ہے۔ وہ اپجاؤ کی ساری صلاحیت رکھتے ہوئے اپجنے سے محروم رہتا ہے۔

یہی حال انسان کا ہے۔ اگر وہ بے صبری کی حالت میں ہو تو وہ خدا کی سرسبز و شاداب دنیا میں ایک ٹھنٹھ کی مانند سوکھا ہوا پڑا رہے گا۔ لیکن صبر کو اختیار کرتے ہی وہ اچانک خدا کی زمین میں اپنی جڑیں پا لیتا ہے اور بڑھتے بڑھتے بالآخر پورا درخت بن جاتا ہے۔

جب آدمی حقیقی معنوں میں صبر کا ثبوت دیتا ہے تو وہ بندوں کی سطح پر جینے کے بجائے خدا کی سطح پر جینے لگتا ہے۔ دنیا کی تنگیوں سے گذر کر وہ آخرت کی وسعتوں میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ بے معنی زندگی کے مرحلہ سے نکل کر بامعنی زندگی کے مرحلہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

صبر والا انسان ہی مومن انسان ہے۔ اسی کے لئے وہ ابدی انعام مقدر کیا گیا ہے جس کا دوسرا نام جنت ہے۔

کتاب مہجور

قرآن کی سورہ نمبر ۲۵ میں ارشاد ہوا ہے:

وقال الرّسول یٰربّ ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا (فرقان - ۳۰)

اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھیرا دیا اس قرآن کو چھوڑا ہوا۔

اس آیت سے اولاً وہ لوگ مراد ہیں جن کے سامنے قرآن آتا ہے مگر وہ اس پر ایمان نہیں لاتے جیسا کہ مکی دور میں قریش نے کیا۔ تاہم اس نفسیات کا عملی مظاہرہ کبھی ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے جو بظاہر قرآن کو ماننے والوں کی فہرست میں داخل ہوں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر قرآن میں آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے۔ تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا، اس میں تدبر نہ کرنا، اس کی تلاوت نہ کرنا، اس کی تصحیح قرأت کی طرف توجہ نہ کرنا، اس سے اعراض کرکے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا، یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجران قرآن کے تحت داخل ہو سکتی ہیں۔"

قرآن کے ماننے والوں کے لئے قرآن کو "کتاب مہجور" بنانے کی یہ شکل کبھی نہیں ہوتی کہ اس کا احترام وتقدس لوگوں کے دلوں میں باقی نہ رہے۔ برکت اور تقدس کا نشان ہونے کی حیثیت سے وہ ہمیشہ اس کو اپنے طاق کی زینت بنائے رہتے ہیں۔ البتہ وہ اس سے فکری رہنمائی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ خدا کی کتاب ان کے لئے ذہنی غذا نہیں ہوتی۔ وہ ان کی حقیقی زندگی کا سرمایہ نہیں بنتی۔ وہ ان کی دنیا پرستانہ زندگی کے لئے "برکت کا تعویذ" تو ضرور ہوتی ہے مگر آخرت کی رہنما کتاب کی حیثیت سے ان کی زندگی میں اس کا کوئی مقام نہیں ہوتا —— یہ مطلب ہے خدا کی کتاب کو "کتاب مہجور" بنا دینے کا۔

جو لوگ قرآن کو نہ مانیں ان کے لئے قرآن کا چھوڑنا یہ ہے کہ وہ اس کو خدا کی اتاری ہوئی کتاب ماننے سے انکار کر دیں۔ اور جو لوگ قرآن کو مانتے ہوں ان کے لئے قرآن کا چھوڑنا یہ ہے کہ وہ زبان سے قرآن کو خدا کی کتاب کہیں اور اپنی زندگی کو اس کے خلاف چلائیں۔ وہ قرآن کو عقیدۃً مانتے ہوئے عملاً اسے چھوڑ دیں۔

جب مسلمانوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ قرآن میں غور وفکر نہ کریں۔ وہ اپنے مسائل کا حل قرآن میں تلاش کرنا چھوڑ دیں۔ وہ قرآن کے انداز پر سوچنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ ان کی سرگرمیوں کی بنیاد قرآن نہ رہے تو گویا انھوں نے قرآن کو مانتے ہوئے قرآن کو چھوڑ دیا۔ انھوں نے قرآن کو کتاب مہجور بنا دیا۔

اسلام کے نام پر

عثمانی ترکوں میں سلطان سلیم نہایت بیدار مغز بادشاہ گزرا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جب اس کو اقتدار ملا تو ایک طرف یورپ زبردست ترقی کے مقام کو پہنچ چکا تھا اور دوسری طرف ترکی تقریباً ڈھائی صدی کے عروج کے بعد زوال کا شکار ہو کر "یورپ کا مرد بیمار" بن رہا تھا۔ ان حالات میں سلطان نے ترکی کو از سر نو طاقت ور اور ترقی یافتہ بنانے کی کوشش کی۔

اس وقت سلطان سلیم کی زبردست مخالفت کی گئی۔ یہ مخالفت کرنے والے ملک کے علماء تھے۔ سلطان نے فوجوں کی جدید تنظیم کے لئے سنگین والی رائفلیں منگوائیں تو علماء نے کہا کہ یہ کافروں کا ہتھیار ہے اور اس بنا پر اس کا استعمال حرام ہے۔ اس نے سپاہیوں کے استعمال کے لئے جدید طرز کی فوجی وردیاں بنوائیں تو علماء نے کہا کہ یہ تشبہ بالنصاریٰ ہے اور تشبہ بالنصاریٰ سے ہم کو منع کیا گیا ہے وغیرہ۔

سلطان سلیم کے عمل کو بے دینی قرار دیا گیا اور یہ کہہ کر عوام کے اندر اس کے خلاف نفرت پھیلائی گئی کہ وہ مسلمانوں کے اندر کافروں کے طریقے رائج کر کے اسلام کو بگاڑ رہا ہے۔ حتیٰ کہ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے یہ فتویٰ دیا کہ سلطان سلیم قرآن کے خلاف عمل کر رہا ہے اور جو بادشاہ قرآن کے خلاف عمل کرے وہ بادشاہ بننے کے قابل نہیں۔

اس زمانہ میں ترکی عوام پر علماء کا بہت اثر تھا۔ ان کی اس قسم کی باتوں سے سلطان کے خلاف زبردست شورش پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۷ میں سلطان کو تخت سے معزول ہونا پڑا۔

ترک علماء جدید دنیا کی سرحد پر ہونے کے باوجود جدید تبدیلیوں سے بالکل ناواقف تھے۔ اپنے خیال کے مطابق اخلاص سے مگر حقیقۃً سراسر نادانی کے ساتھ انھوں نے یہ کوشش کی کہ ترک قوم سات سو سال پہلے کی فضا سے نہ نکلنے پائے۔ سلطان سلیم کے بعد سلطان محمود نے ۱۸۲۶ میں دوبارہ عسکری تنظیم میں جدید طریقوں کو رائج کیا۔ مگر ترک عالموں اور درویشوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ بدعت ہے۔ سلطان بے دین ہو گیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر وہ اپنے ایمان کو بچانا چاہتے ہیں تو فوج میں بھرتی نہ ہوں۔

اس قسم کے واقعات نے ترکی کی نئی نسل میں ردعمل پیدا کیا۔ وہ سمجھنے لگے کہ اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ وہ زمانے کے ساتھ چل سکے۔ ۱۹۰۸ میں نوجوانوں کی جماعت کے ہاتھوں سلطان عبدالحمید خاں کا اقتدار سے بے دخل کیا جانا اسی اسلام بیزاری کا نتیجہ تھا جس نے بالآخر کمال اتاترک کے دور کو پیدا کیا۔

بے معنیٰ الفاظ

ایک شخص نے غیر مادی حقیقتوں کی مادی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے ــــ "فکر و ادراک ایک مرکب ہے جو فارمک ایسڈ (Formic Acid) کے مشابہ ہوتا ہے ــــ اور قوت مدرکہ فاسفورس کے تابع ہوتی ہے۔ اور نیکی، سچائی اور بہادری در اصل انسانی اعضاء کی برقی لہریں ہیں"

یہ جملہ قواعد زبان کے لحاظ سے بالکل درست ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے بے معنیٰ الفاظ کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

اگر غیر مادی حقیقتیں صرف مادی تعامل کا نتیجہ ہیں جیسا کہ اوپر کے فقرہ میں ظاہر کیا گیا ہے تو انسان کے لئے کیوں کر ایسا ممکن نہ ہو سکا کہ وہ اپنی تجربہ گاہ میں ان مظاہر کو پیدا کر سکتا۔

فارمک ایسڈ کے استعمال پر انسان کو پوری طرح اختیار حاصل ہے۔ پھر کیوں ایسا ممکن نہ ہوا کہ فارمک ایسڈ کے مخصوص استعمال سے وہ فکر انسانی جیسی چیز پیدا کر لیتا۔ اسی طرح فاسفورس ایک ایسی چیز ہے جس پر انسان کو پورا قبضہ حاصل ہے۔ پھر وہ فاسفورس پر عمل کر کے قوت مدرکہ کو کیوں نہیں پیدا کر لیتا۔

یہی معاملہ برقی لہروں کا ہے۔ آج انسان کو برقی لہروں پر پورا کنٹرول حاصل ہو چکا ہے۔ پھر کیوں ایسا ممکن نہ ہوا کہ برقی لہروں کے کسی خاص استعمال سے وہ چیز پیدا کر لی جاتی جس کو نیکی، سچائی اور بہادری کہا جاتا ہے۔

آدمی جب کسی بات کو نہ ماننا چاہے تو وہ ایسے الفاظ بولتا ہے جو اگرچہ ڈکشنری میں لکھے ہوئے ہیں مگر اس کی زبان سے نکلے ہوئے مجموعہ میں وہ اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔

نئی مطبوعات

ظہور اسلام	غیر مجلد	۲۵ روپے
"	مجلد	۳۰ روپے
مذہب اور سائنس		چھ روپے
حقیقت کی تلاش		تین روپے

خصوصی صلاحیت

عرصہ ہوا میں نے ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس کے مغربی مضمون نگار نے بہت سے بڑے لوگوں کے حالات زندگی کو پڑھ کر یہ متعین کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ کون سی مشترک صفت ہے جو کسی بڑے آدمی کو بڑا بناتی ہے۔ اس نے اپنی تحقیق کے بعد بتایا تھا کہ وہ لوگ جو کسی بڑی ترقی کے مقام کو پہنچتے ہیں ان میں دو خاص صفت پائی جاتی ہے :

Curiosity and Discontent

یعنی تجسس اور عدم قناعت۔ تجسس ہمیشہ ان کو عمل میں مصروف رکھتا تھا اور عدم قناعت نے انھیں کسی مقام پر رکنے نہیں دیا۔

ولٹشائر (Wiltshire) کی میتھیمیٹکس ایڈوائزر مسز انیتا اسٹریکر Mrs Anita Straker نے اسکولس کونسل کے لئے ۸۰ صفحات پر مشتمل ایک تعلیمی رپورٹ تیار کی ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ موہوب لڑکوں (Gifted Children) کی صفات کیا ہوتی ہیں۔ رپورٹ کے الفاظ میں ان میں سے ایک خاص صفت یہ ہے :

> Pupils who are impatient with anything that is second best are probably gifted

جو طلبہ ایسی چیز پر راضی نہ ہوتے ہوں جو دوسری بہتر چیز ہے، گمان غالب ہے کہ وہ خصوصی وہبی صلاحیت کے مالک ہوں گے (ہندستان ٹائمس ۲ فروری ۱۹۸۳)

کسی انسان کی یہ نہایت اعلیٰ خصوصیت ہے کہ وہ پہلی بہتر چیز سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوتا ہو۔ یہی خصوصیت آدمی کے لئے تمام خوبیوں اور بڑائیوں کا زینہ ہے۔

یہ مزاج آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ کامل سچائی کی طرف بڑھتا چلا جائے اور کسی ادھوری سچائی پر نہ ٹھہرے۔ یہ مزاج اس کو پست کرداری سے اٹھاتا ہے اور اعلیٰ کردار والا بناتا ہے۔ یہ مزاج اس کو چھوٹی کامیابی پر قانع نہیں ہونے دیتا۔ اور برابر بڑی ترقیوں کی طرف بڑھاتا رہتا ہے۔ یہ مزاج اس کو اس قابل بناتا ہے کہ اپنی ڈیوٹی انجام دینے میں وہ صرف معیاری صورت کو اپنے سامنے رکھے۔ اور اپنی ڈیوٹی کو پوری طرح انجام دے کر خوشی حاصل کرے۔ یہ مزاج آدمی کے خود اپنے اندر ایک ایسا محرک رکھ دیتا ہے جو آدمی کو اکساتا رہتا ہے کہ وہ صرف خیر اعلیٰ پر ٹھہرے، اس سے کم کسی چیز پر اپنے کو راضی نہ ہونے دے۔

کچھ سے کچھ

دیوی سنگھ ایک مشہور ڈاکو تھا جو جنوری ۱۹۸۴ میں پولیس کے ساتھ ایک مقابلہ میں مارا گیا۔ مسز امرت پریتم کی ایک اتفاقی ملاقات مذکورہ ڈاکو سے سیورا گاؤں میں ہوئی۔ اس موقع پر دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس کی دل چسپ روداد ہندستان ٹائمس (۲۲ جنوری ۱۹۸۴) میں شائع ہوئی ہے۔

دیوی سنگھ نے بتایا کہ میں نے اب تک تقریباً ایک سو ڈاکے ڈالے ہیں۔ ہم لوگ ڈاکو نہیں ہیں بلکہ حکومت کے باغی ہیں۔ ہم مال لوٹتے ہیں مگر ہم نے آج تک کسی لڑکی کی عصمت نہیں لوٹی۔ ہمارا ایک سخت قسم کا اخلاقی اصول ہے۔ ہمارا کوئی آدمی اس کے خلاف کرے تو ہم فوراً اس کو گولی مار دیتے ہیں۔

امرت پریتم نے کہا کہ دیوی سنگھ جی، یہ بتائیے کہ آپ کی ٹولی (گینگ) میں کل کتنے آدمی ہیں۔ دیوی سنگھ نے کہا کہ سات آدمی، اور آٹھواں خدا:

Seven men, and the eighth God

بظاہر یہ جملہ، معمولی فرق کے ساتھ، قرآن کی اس آیت کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم میں سے پانچ آدمی جہاں ہوتے ہیں وہاں چھٹا خدا ہوتا ہے (المجادلہ) پھر کیا ڈاکو کی بات انھیں معنوں میں ہے جن معنوں میں وہ قرآن میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ دونوں کے درمیان لفظی مشابہت کے سوا کوئی اور چیز مشترک نہیں۔

ڈاکو نے کس معنی میں یہ بات کہی، وہ خود مذکورہ انٹرویو میں موجود ہے۔ اس نے کہا کہ ہم لوگ ڈاکہ کے ذریعہ جو کچھ حاصل کرتے ہیں اس کو ہم اپنی ٹولی کے درمیان بانٹتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری ٹولی میں سات افراد ہیں تو ہم لوٹے ہوئے مال کے آٹھ حصے بناتے ہیں۔ سات حصے اپنے افراد کے لئے اور ایک حصہ خدا کے لیے۔ خدا کا جو حصہ ہے اس کو ہم کسی غریب کو دیدیتے ہیں۔ آمدنی کا ایک حصہ مذہب کے نام پر خدا کو دینا یہ تمام ڈاکوؤں کا طریقہ ہے۔

قرآن کا خدا خوف پیدا کرتا ہے اور ڈاکوؤں کا خدا بے خوفی۔ خدا اس لئے تھا کہ وہ آدمی کو ڈاکہ بازی سے روکے۔ مگر ڈاکوؤں نے خدا کا حصہ لگا کر اس کو اپنے ڈاکہ کا چوکیدار بنا لیا۔ گویا جب وہ سات مل کر ڈاکہ ڈالیں تو خدا ان کا آٹھواں بن کر ان کی حفاظت کے لئے موجود رہے۔

ایک فرق

نیوڈائجسٹ (ہانگ کانگ) نے ایک دلچسپ گفتگو نقل ہے۔ایک اسرائیلی نے دوسرے اسرائیلی سے پوچھا:

When Moses led the people out of bondage, why did he have to take them to the only place in West Asia that does not have oil.

جب حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی قید سے چھڑایا تو کیوں ایسا ہوا کہ وہ ان کو مغربی ایشیا کے اس واحد مقام پر لے گئے جہاں تیل نہیں تھا۔ دوسرے اسرائیلی نے اس سوال کو سنا تو مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکالا تو اولاً وہ ان کو صحرائے سینا میں لے گئے۔اس کے بعد باقاعدہ منصوبہ کے تحت ان کو فلسطین پہنچایا گیا۔فلسطین قدیم زمانہ میں نہایت سرسبز و شاداب زراعتی ملک تھا۔مگر اس کی زمین کے نیچے تیل نہیں پایا جاتا۔مغربی ایشیا کے ہر ملک میں تیل ہے۔مگر فلسطین کی زمین کے نیچے تیل نہیں۔یہی وجہ ہے کہ فلسطین آج ایک غیر خود کفیل ملک ہے۔اگر اس کو باہر سے امداد نہ ملے تو موجودہ صنعتی دور میں وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

پھر یہ عجیب بات ہے کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم عرب میں ظاہر ہوئے جو اس زمانہ میں بالکل ریگستان تھا۔اس وقت وہاں کے لوگ شام اور فلسطین کی سرسبزی پر رشک کرتے تھے۔مگر موجودہ زمانہ میں صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔عرب کے صحرا جو پانی کے قحط میں مبتلا تھے،وہاں تیل کے دریا بہہ رہے ہیں جو جدید صنعتی دور میں ہر دوسری چیز کا بدل ہے۔

عربوں کی دولت مندی آج لوگوں کے لئے قابل رشک بن گئی ہے —— فلسطین کی قومی آمدنی اپنی ضرورت سے بہت کم ہے اور عرب کی قومی آمدنی اپنی ضرورت سے بہت زیادہ۔

اس واقعہ میں غالباً ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ حضرت موسیٰ کا زمانہ نبوت زراعت کے دور تک تھا۔جب کہ حضرت محمدؐ کا زمانہ نبوت صنعت کے دور تک پھیلا ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام "حال" کے پیغمبر تھے اور حضرت محمدؐ صلے اللہ علیہ وسلم حال سے لے کر مستقبل تک کے پیغمبر۔

سب سے مشکل کام

ڈیل کارنیگی (Dale Carneigi) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: دوست کیسے بنائیں اور لوگوں کو کس طرح متاثر کریں *(How to Win Friends and Influence People)* اس کتاب میں اس نے لوگوں کے درمیان محبوبیت حاصل کرنے کے جو گر بتائے ہیں وہ یہ کہ کسی پر بھی تنقید نہ کیجئے۔ تنقید بڑی خطرناک چیز ہے۔ کیونکہ وہ آدمی کے قیمتی فخر کو مجروح کرتی ہے۔ اس کے احساسِ اہمیت کو گزند پہنچاتی ہے اور ناراضگی کا جذبہ ابھارتی ہے:

Criticism is dangerous, because it wounds man's percious pride, hurts his sense of importance, and arouses his resentment.

ڈیل کارنیگی نے چند الفاظ میں بہت خوبی کے ساتھ بتا دیا ہے کہ لوگ کیوں اپنے خلاف تنقید سن کر برہم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو بڑائی کے جس مقام پر بٹھا رکھا ہے، تنقید اس کو وہاں سے اتارتی ہوئی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر وہ تنقید جو صحیح اور درست ہو۔

آدمی اتنا زیادہ خود پسند ہے کہ وہ کسی حال میں اپنی غلطی کو ماننا نہیں چاہتا "میں غلطی پر تھا" صرف چار الفاظ کا ایک جملہ ہے جس کو کہنے کے لئے مشکل سے دو سکنڈ درکار ہیں۔ مگر یہ جملہ اتنا مشکل ہے کہ ساری تاریخ میں بہت کم انسان ایسے ملیں گے جنھوں نے واقعۃً یہ الفاظ بولنے کی جرأت کی ہو۔

کرولی (Crowley) نے لانگ آئی لینڈ میں ایک جگہ اپنی کار کھڑی کی۔ اتنے میں پولیس کا ایک آدمی آیا اور کہا کہ مجھے اپنا لائسنس دکھاؤ۔ کرولی نے بندوق اٹھائی اور گولی مار کر سپاہی کو ہلاک کر دیا۔ مئی ۱۹۳۱ میں وہ پکڑا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا۔ جج نے فیصلہ کیا کہ اس کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر ہلاک کر دیا جائے۔ جب وہ موت گھر میں لے جایا جا رہا تھا تو رپورٹ بتاتی ہے کہ اس نے کہا، کیا یہ اس کا نتیجہ ہے کہ میں نے لوگوں کو قتل کیا۔ نہیں، یہ اس کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنا دفاع کیا:

This is what I get for killing people?
No, this is what I get for defending myself.

کرولی ساری دنیا کے نزدیک مجرم تھا، مگر اس کے خود پسند دماغ نے ایسے الفاظ پالئے جن کے مطابق اس کا وجود اس کو بالکل بے قصور نظر آئے ——— کوئی آدمی اس طرح برسرِ حق نہیں ہو جاتا کہ اپنے آپ کو برسرِ حق ظاہر کرنے کے لئے اسے کچھ الفاظ مل جائیں۔ برسرِ حق وہ شخص ہے جو حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے برسرِ حق ہو نہ کہ خود اپنے بولے ہوئے الفاظ کے اعتبار سے۔

ردعمل کے بغیر

ایک ہندی کہاوت ہے ـــــ چوٹ سہے جو شبد کی وائے گرو میں داس۔ یعنی جو شخص لفظ کی چوٹ سہہ سکے وہ اس قابل ہے کہ اس کو پیشوائی کا درجہ دیا جائے اور دوسرے لوگ اس کے خادم بن کر رہیں۔

لفظ کو سن کر بظاہر نہ کسی کا خون بہتا اور نہ کسی کا ہاتھ پاؤں ٹوٹتا۔ مگر لفظ کی چوٹ کو برداشت کرنا بلاشبہ کسی آدمی کے لئے مشکل ترین کام ہے۔ لفظ کی چوٹ وہی شخص برداشت کر سکتا ہے جس کے اندر گہرائی ہو۔ جو ظاہری سطح سے اوپر اٹھ کر چیزوں کو دیکھ سکے۔

مسٹر کرشنا مورتی (عمر ۹۰ سال) ہندستان کے مشہور مفکر ہیں۔ وہ نہایت عمدہ انگریزی بولتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تقریروں میں انگریزی داں طبقہ ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتا ہے۔ ہندستان کے علاوہ مغربی ملکوں میں بھی ان کی تقریریں دل چسپی سے سنی جاتی ہیں۔

تاہم کرشنا مورتی کو یہ شکایت ہے کہ کوئی ان کے خیالات کو عملی طور پر نہیں اپناتا۔ مدراس کی ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ ۵۰ سال سے میں دنیا بھر میں سفر کرکے اپنے خیالات پیش کر رہا ہوں مگر لوگوں کے اندر کوئی عملی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ "کیا آپ لوگ اپنے آپ کو بدل لیں گے"، انھوں نے مجمع سے سوال کیا، پھر خود ہی جواب دیا "آپ لوگ میری باتیں سن کر واپس چلے جائیں گے اور بدستور ویسا ہی کرتے رہیں گے جیسا اب تک کر رہے تھے"

یہ سن کر مجمع سے ایک شخص اٹھا اور سخت غصہ میں کہا "ہر سال آپ یہی کہتے ہیں کہ ہم آپ کا ساتھ نہیں دیتے۔ پھر کس لئے آپ ہم کو اپنی بات سناتے رہتے ہیں"، اس کے جواب میں مسٹر کرشنا مورتی نے نہایت نرمی کے ساتھ کہا :

Sir, have you ever asked a rose why does it bloom?

جناب، کیا آپ نے کبھی گلاب سے پوچھا ہے کہ وہ کیوں کھلتا ہے (ہندستان ٹائمس ۲۴ فروری ۱۹۸۴)

تنقیدی بات سن کر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بپھر اٹھتا ہے۔ مگر ایسے موقع پر بپھرنا خود اپنا ہی نقصان کرنا ہے۔ اگر آپ مخاطب کی تنقید سن کر غصہ ہو جائیں تو آپ صرف تیز و تند الفاظ بولیں گے۔ لیکن اگر ایسے موقع پر آپ اپنے جذبات کو سنبھال لیں تو آپ ایسی بات کہہ سکتے ہیں جو دل میں اتر جائے اور مخاطب کو خاموش کر دے۔

عبرت ناک

عالمی ادارہ صحت کی طرف سے ایک ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام و پتہ یہ ہے:

World Health, WHO, Av. Appia, 1211 Geneva 27, Switzerland

اس ماہنامہ (ورلڈ ہیلتھ) کے شمارہ اکتوبر ۱۹۸۳ میں ایک رپورٹ ان الفاظ میں درج ہے:

Eight years ago, 197 people became ill on a long-distance flight. Ham omelettes had been contaminated by a cook with an infected sore on his hand, and poor temperature control in the kitchen and on board the plane had allowed the organism (Staphylococus aureus) to grow in the food and produce a toxin. The infection sent 144 of the victims to hospital, though all eventually recovered. Nontheless the airline catering manager took the balme for the incident and committed suicide.

آٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے، ۱۹۷ مسافر ایک ہوائی جہاز کے لمبے سفر میں بیمار پڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو سفر کے دوران جو آملیٹ کھانے کے لئے دیا گیا وہ باورچی کے ہاتھ میں ایک زخم کی وجہ سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جہاز میں جب اس کو رکھا گیا تو ٹمپریچر کنٹرول کا اچھا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اس آملیٹ میں بیکٹیریا آ گئے اور وہ زہریلا بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاز کے ۱۴۴ مسافروں کو اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ یہ تمام مریض اگرچہ بعد کو اچھے ہو گئے۔ مگر مذکورہ ایئر لائن کے غذائی منیجر نے خودکشی کر لی (صفحہ ۷)

منیجر کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے مسافروں کو ناقص خوراک فراہم کی جس کی وجہ سے اس کو کھانے والے بیمار پڑ گئے۔ کمپنی کے منیجر کو اس غلطی کا اتنا زیادہ احساس ہوا کہ اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ یہی غلطی اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین نے کی ہے۔ انھوں نے اپنے پیروؤں کو غلط رہنمائی دی۔ انھوں نے بے شمار مسلمانوں کو ایسی سمتوں میں دوڑا دیا جس کا مسافر کسی منزل تک پہنچنے والا نہ تھا۔ مگر غلطی واضح ہونے کے بعد بھی ان میں سے کوئی نہ تھا جو "خودکشی" کر لے۔ جو قیادت کے میدان سے واپسی پر راضی ہو جائے۔

ہمارے قائدین کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ اپنی جھوٹی اچھل کود کو اسلامی پروگرام کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنے بے فائدہ اقدام کو جہاد کا نام دے سکتے ہیں۔ ان کی غیر دانش مندانہ پالیسی سے لوگ برباد ہوں تو اس کو وہ قربانی کا شاندار عنوان دے سکتے ہیں۔ بے معنی ٹکراؤ کی سیاست اختیار کرنے سے لوگ مارے جائیں تو اس کے لئے انھیں شہادت کا خوش نما ٹائٹل مل جاتا ہے —— وہ لوگ جو اس قابل بھی نہیں کہ کسی ہوائی کمپنی میں خوراک کے منیجر بن سکیں وہ قوم کے پیچیدہ تر معاملات کے ذمہ دار بنے ہوئے ہیں۔

دریافت

لندن سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے دریافت کرنے والے :

The Discoverers:
A History of Man's Search to Know His World and Himself by Daniel Boorstin, Randon House, p. 745

مصنف نے اس کتاب میں دریافتوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ مختلف لوگ جنھوں نے کسی شعبۂ علم میں کوئی نئی چیز یا نیا نظریہ دریافت کیا وہ مصنف کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے ہیں۔ مصنف دریافت کرنے والوں کی شخصیت سے اتنا متاثر ہے کہ وہ کہہ اٹھتا ہے کہ میرا ہیرو دریافت کرنے والا انسان ہے :

My hero is Man the Discoverer

یہ صرف مذکورہ مصنف کی بات نہیں بلکہ یہ عام انسانی فطرت کی بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ "دریافت" ہر انسان کی محبوب ترین چیز ہے۔ جو آدمی کسی نئی چیز کا اکتشاف کرے وہ لوگوں کی نظر میں اعلیٰ ترین انسان کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

حق کا داعی بھی ایک اعتبار سے دریافت کرنے والا (Discoverer) ہوتا ہے۔ وہ باطل کے مقابلہ میں حق کو دریافت کرتا ہے۔ جو چیز لوگوں کو معلوم نہیں ہے اس کو معلوم کر کے لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔ (علم الانسان مالم یعلم)

دریافت حقیقۃً لوگوں کی چھپی طلب کے جواب کا دوسرا نام ہے۔ لوگوں کے دل میں یہ خواہش چھپی ہوئی تھی کہ وہ مواصلات Communications کے لئے تیز رفتار ذریعہ پالیں۔ جب ایک شخص نے تیز رفتار ذریعہ سفر دریافت کیا تو گویا اس نے ہزاروں برس سے لوگوں کی چھپی ہوئی تمنا کو پورا کیا۔ اس بنا پر وہ لوگوں کا محبوب بن گیا۔

یہی معاملہ حق کا ہے۔ ہر دور میں ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے خدا کے بندے اس تلاش میں ہوتے ہیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ اب ایک شخص جو خود بھی اس تلاش سے دوچار تھا وہ حق کو اس کی کامل صورت میں دریافت کرتا ہے۔ اور اس کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے چھپے ہوئے سوال کا جواب بن جائے۔ جب ایسا شخص ظہور میں آتا ہے تو بالکل فطری طور پر وہ ان تمام لوگوں کا "ہیرو" قرار پاتا ہے جن کو اس نے تلاش کے دلدل سے نکالا تھا —— دریافت کرنے والا شخص لوگوں کی نظر میں ہیرو بن جاتا ہے اور اسی طرح حق کو دریافت کرنے والا بھی۔

اختلاف کا نقصان

مسلمان ہر سال حج کے لئے ہزاروں کی تعداد میں سمندری سفر کرتے ہیں۔ مگر جہاز رانی کے کاروبار میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ عرب ملکوں سے پٹرول بہت بڑی مقدار میں ہندستان آرہا ہے۔ مگر پٹرولیم صنعتوں میں مسلمانوں کا کوئی مقام نہیں۔ مسلمان بے شمار کتابیں چھاپتے ہیں مگر سارے ملک میں کوئی بھی پیپر مل مسلمانوں کی نہیں پائی جاتی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ تمام کام بڑے بڑے صنعتی کام ہیں اور بڑے بڑے صنعتی کام موجودہ زمانہ میں صرف جوائنٹ اسٹاک کمپنی اور کوآپریٹو سوسائٹی کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔ اور مسلمان اپنی بے شعوری اور اپنے غیر اتحادی مزاج کی وجہ سے جوائنٹ اسٹاک کمپنی اور کوآپریٹو سوسائٹی چلانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

مشہور ایسٹ انڈیا کمپنی جوائنٹ اسٹاک کمپنی تھی۔ یعنی بہت سے انگریزوں کے سرمایہ سے مل کر اس کی تشکیل ہوئی تھی۔ وہ دسمبر ۱۶۰۰ میں وجود میں آئی۔ ۱۶۰۱ میں اس نے سورت میں اپنی پہلی فیکٹری قائم کی۔ مغل حکمراں جو صرف "تلوار" کی طاقت کو جانتا تھا اور "صنعت" کی طاقت سے بے خبر تھا، اس نے فراخ دلی کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندستان میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۲۵ سال کے عرصہ میں اس نے بہت سے ہندستانی شہروں میں اپنے صنعتی مراکز قائم کرلئے اور اتنی ترقی کی کہ بالآخر ملک پر قابض ہوگئی۔

مغربی کمپنیوں کو دیکھ کر ہندستان کے دوسرے فرقوں نے بھی اپنی جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں قائم کیں اور کافی ترقی کی۔ مگر ہندستان کے مسلمان اس میدان میں پیچھے رہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ہندستان کی آبادی کا تقریباً سولہ فی صد حصہ صنعتی سیکٹر سے وابستہ ہے۔ مگر اس میں مسلمانوں کا تناسب ایک فی صد سے بھی کم (۲ر۰) ہے۔ مسلمان کوئی بھی بڑا پروجیکٹ نہیں چلا سکے کیوں کہ بڑا پروجیکٹ چلانے کے لئے بہت سے لوگوں کو مل کر کام کرنا پڑتا ہے۔ اور مسلمان مل کر کام کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

اقتصادیات کا تعلق کسی ایک شعبہ سے نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔ مسلمان اقتصادیات میں پیچھے ہونے کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبوں میں پیچھے ہوگئے ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ متحد ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ اتحاد بظاہر ایک داخلی چیز ہے۔ مگر یہ داخلی چیز آدمی کو خارجی دنیا کی کامیابیاں دے دیتی ہیں۔

نتیجہ نہ کہ ہدف

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز بظاہر صحیح ہوتی ہے مگر سیاق کے بدلنے سے وہ غلط ہو جاتی ہے مثلاً ایک چیز جو کسی عمل کا نتیجہ ہو اس کو آپ اپنے عمل کا ہدف بنالیں تو یہ غلط بھی ہوگا اور اپنے انجام کے اعتبار سے لاحاصل بھی۔

قرآن مجید کی سورہ ۹۴ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے تمہارا آوازہ بلند کیا (ورفعنالك ذكرك) اس سے مراد وہ غیر معمولی شہرت و عزت ہے جو پیغمبر اسلام کو دنیا میں حاصل ہوئی۔ آپ کا رفع ذکر ساری دنیا میں اتنا مسلم ہو چکا ہے کہ آج ایک غیر مسلم جب ساری تاریخ انسانی کے ایک سو بڑوں کی فہرست بناتا ہے تو اس میں وہ آپ کا نام سب سے پہلے درج کرتا ہے۔

مگر اپنا آوازہ بلند کرنا آپ کا ہدف نہیں تھا بلکہ آپ کے اصل مشن کا ایک نتیجہ تھا۔ اس سلسلے میں ایک حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے :

قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اتانی جبریل فقال ان ربّی وربك یقول کیف رفعت ذکرك. قال اللہ اعلم، قال اذا ذکرتُ ذکرتَ معی۔ (تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل میرے پاس آئے اور کہا کہ میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کیسے تمہارا نام بلند کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ جبریل نے کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ اس طرح کہ جب میرا نام لیا جائے تو تمہارا نام بھی لیا جائے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ آپ کا نام کیسے بلند ہوا یا کیسے بلند ہوگا۔ یہ جو کچھ ہوا یہ سراسر آپ کی کوشش اور آپ کی خواہش کے بغیر ہوا۔

اس مثال سے ہدف اور نتیجہ کا فرق سمجھ میں آتا ہے۔ دعوت آپ کا ہدف تھا اور رفع ذکر اس کا نتیجہ اب اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ وہ "رفع ذکر" کو ہدف (پیغمبر کا مشن) سمجھ لے اور اپنا نام بلند کرنے کی کوشش کرنے لگے تو یہ بالکل غلط ہوگا۔ یہ پیغمبر کی سنت کی خلاف ورزی ہوگی نہ کہ اس کی پیروی۔

یہی معاملہ دنیوی اقتدار کا ہے۔ اقتدار خدا کا ایک انعام ہے جو دعوتی عمل کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے کسی گروہ کو دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی گروہ ایسا کرے کہ دنیوی اقتدار کے حصول کو نبوت کا ہدف قرار دے کر ہنگامہ آرائی شروع کر دے تو یہ بھی سراسر غلط ہوگا۔ یہ اسی طرح نتیجہ کو ہدف کا مقام دینے کے ہم معنی ہوگا جس طرح وہ رفع ذکر کی مذکورہ بالا مثال میں نظر آتا ہے۔

کردار کی طاقت

لوگ عام طور پر دو ہی قسم کے لوگوں کو طاقت ور سمجھتے ہیں۔ ایک وہ جن کے پاس مادی چیزوں کا ڈھیر ہو۔ دوسرے وہ جو داداگیری کرنا جانتے ہوں۔ مگر طاقت کا سب بڑا راز کردار ہے۔ مزید یہ کہ کردار ایک ایسی چیز ہے جس کا مالک ہر ایک آدمی بن سکتا ہے۔ اس کے لئے نہ مادی دیو ہونا ضروری ہے اور نہ جسمانی پہلوان ہونا۔

مولانا محمد قاسم قاسمی (پیدائش ۱۹۵۷) مدرسہ حسین بخش دہلی میں استاد ہیں اور اسی کے ساتھ ایک مسجد میں امام ہیں۔

موصوف نے دہلی میں گھڑی کی مرمت کی دکان کھولی۔ ان کو اپنی دکان پر بٹھانے کے لئے ایک کاریگر کی ضرورت تھی۔ اس اثنا میں یہ ہوا کہ ایک روز ان کی مسجد میں ایک شخص نے نماز پڑھی۔ عمر تقریباً ۴۰ سال تھی۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا نام محمد دین کشمیری ہے اور وہ گھڑی کا کام جانتے ہیں۔

"آپ دہلی میں کیسے آئے" مولانا محمد قاسم نے پوچھا۔

"کام کی تلاش میں" محمد دین کشمیری نے جواب دیا۔

"آپ گھڑی کی مرمت کا کام جانتے ہیں"

"الحمد للہ جانتا ہوں اور میں اپنے کام پر مطمئن ہوں"

"دہلی میں کوئی آدمی ہے جو آپ کی ضمانت لے سکے"

"میرا ضامن صرف اللہ ہے۔ اگر آپ کو اللہ کی ضمانت پر اطمینان ہو تو میں اس کو اپنی ضمانت میں پیش کر سکتا ہوں" محمد دین کشمیری کی گفتگو کے اس انداز نے مولانا محمد قاسم کو متاثر کیا اور انھوں نے ان کو اپنی دکان پر رکھ لیا۔ اب اس واقعہ کو کئی مہینے گذر چکے ہیں اور خدا کے فضل سے دونوں فریق مطمئن ہیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب کی دکان بھی کامیاب ہے اور محمد دین کشمیری صاحب کو بھی روزگار مل گیا ہے۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ کردار خود اپنے اندر طاقت رکھتا ہے۔ اگر آدمی باکردار ہو تو اس کا باکردار ہونا اس کی زبان میں یقین اور عزم کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور جہاں یقین اور عزم آجائے وہاں کامیابی اسی طرح آتی ہے جس طرح سورج کے بعد روشنی اور پانی کے بعد سیرابی۔

خدا کی دریافت

نکیتا خروشچیوف نے کہا تھا " ہمارا راکٹ چاند تک گیا مگر اس کو کہیں خدا نہیں ملا "، کمیونسٹ روس کے سابق صدر نے یہ بات نعوذ باللہ بطور مذاق کہی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے تمام سیکولر محققین پر وہ پوری طرح صادق آتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانے پر فطرت کے علوم کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک کی مختلف چیزوں کی تحقیق میں بے شمار لوگوں نے اپنی عمریں صرف کر دیں۔ مگر ان لوگوں کی کتابیں پڑھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں کہیں ان کی خدا سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ زمین سے لے کر آسمان تک سفر کرتے رہے۔ مگر خدا کی کوئی جھلک انھیں دکھائی نہیں دی۔ انھوں نے خاموش لہروں کے ذریعہ سفر کرنے والی آوازوں کو پکڑ لیا۔ مگر ان کے کان خدا کی آواز سے آشنا نہیں ہوئے۔ ان کی خوردبینوں اور دوربینوں نے انھیں ایسی چیزیں دکھائیں جو اس سے پہلے انسان نے کبھی نہیں دیکھی تھیں مگر خدا کے فرشتوں سے ان کا کبھی مصافحہ نہیں ہوا۔ جو کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ یہی واقعہ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین اور قائدین کے ساتھ بھی کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں پیش آیا ہے۔ جس طرح سیکولر مفکرین کو کائنات کا صرف ظاہر ملا، اس کی اندرونی حقیقت انھیں نہیں ملی۔ اسی طرح مسلم مفکرین کے حصہ میں اسلام کا صرف ظاہری ڈھانچہ آیا۔ وہ اسلام کی اندرونی حقیقت سے آشنا نہ ہو سکے۔

آپ ان مفکرین کی تقریریں سنئے، ان کی سوانح عمریاں پڑھئے، ان کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو ان میں ہر چیز ملے گی مگر وہی چیز نہیں ملے گی جو اسلام کی اصل روح ہے —— ان کے یہاں انسانوں سے ملاقات کا ذکر ہوگا مگر خدا کی کبریائی کا احساس اور خدا سے ملاقات کا کہیں ذکر نہ ہوگا۔ وہ انسانی آرٹ کی بلندی اور تاثیر سے مسحور نظر آئیں گے۔ مگر خدائی آرٹ کی بلندی اور تاثیر سے ان کے اندر کوئی تموج پیدا ہوتا ہوا دکھائی نہیں دے گا۔ دنیا کے واقعات کے چرچے سے ان کی زبان وقلم گونج رہی ہوں گی مگر آخرت کے چرچے کا نشان کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ وہ قومی مسائل اور ملّی مفاخر پر ولولہ انگیز تقریر کرتے ہوئے نظر آئیں گے مگر خدا کے جلال وجمال پر ولولہ انگیز تقریر کبھی ان کے یہاں سنائی نہ دے گی وہ اپنی حیران کن دریافتوں کا انکشاف کریں گے مگر کہیں اس کا نشان نہیں ملے گا کہ ان پر خدا کا انکشاف ہوا اور خدا کی دریافت نے ان کے اندر ہلچل پیدا کر دی۔

دین یا قوم پرستی

دین الگ چیز ہے اور قوم پرستی الگ چیز۔ ایک قول یا عمل جو قوم پرستی کے جذبہ کے تحت کیا جائے وہ بہر حال قوم پرستی ہی رہے گا، اس سے کبھی دینی نتائج برآمد نہیں ہو سکتے، خواہ بظاہر اس کے لئے دین اور اسلام کے الفاظ کیوں نہ استعمال کئے گئے ہوں۔

علامہ اقبال نے کہا تھا:

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

یہی بات ہندستان کے پہلے خلاباز راکیش شرما نے اس وقت کہی جب کہ وہ تین سو کیلومیٹر کی بلندی پر خلا میں اڑ رہے تھے۔ ۵ اپریل ۱۹۸۴ کو ہندستانی خلاباز اور زمین پر بیٹھے ہوئے حکومت ہند کے ذمہ داروں کے درمیان ایک بات چیت ہوئی۔ اس بات چیت کا ایک حصہ، اخباری رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۶ اپریل ۱۹۸۴) کے مطابق یہ تھا:

> Rakesh Sharma told Air Chief Marshal Dilbagh Singh "For the Indian Air Force, the sky is no longer the limit." The Air Cheif Marshal told Sharma that the Indian Air Force was "very proud" of his achievement.

راکیش شرما نے ایر چیف مارشل دلباغ سنگھ سے کہا کہ ہندستانی ہوائیہ کے لئے آسمان اب حد نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ایر چیف مارشل نے شرما سے کہا کہ ہندستانی ہوائیہ کو اس کامیابی پر بہت زیادہ فخر ہے۔

مندرجہ بالا دونوں جملوں میں کس قدر مشابہت ہے۔ حالاں کہ ان میں سے ایک جملہ "مومن" کی زبان سے نکلا ہے اور دوسرا جملہ "کافر" کی زبان سے۔ اب چوں کہ مومن کا کلام اور کافر کا کلام دونوں ایک نہیں ہو سکتا، اس لئے ضروری ہے کہ اس یکسانیت کی کوئی دوسری وجہ تلاش کی جائے۔

اس حیثیت سے جب دونوں کی باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے کلام میں جو مشابہت ہے اس کا سبب قومی جذبہ کی یکسانیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ پہلے شعر کا تعلق ایمان سے ہے اور نہ دوسرے قول کا تعلق کفر سے۔ یہ سراسر قومی جذبہ سے نکلے ہوئے کلام ہیں۔ اقبال چوں کہ مسلم روایات میں پیدا ہوئے اس لئے انھوں نے اپنے قومی جذبہ کا اظہار اسلامی الفاظ میں کیا۔ راکیش شرما کی پرورش وطنیت کے ماحول میں ہوئی اس لئے انھوں نے اپنے قومی جذبہ کے لئے "ہندستان" کا لفظ استعمال کیا۔ دونوں میں صرف ظاہر کا فرق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

اقامت دین

سورہ انعام میں حضرت ابراہیم ، اسحاق ، یعقوب ، نوح ، داؤ ، سلیمان ، ایوب ، یوسف ، موسٰی ، ہارون ، زکریا ، عیسٰی ، یحییٰ ، الیاس ، اسماعیل ، الیسع ، یونس ، لوط علیہم السلام کا ذکر ہے ۔فرمایا گیا ہے کہ ان تمام پیغمبروں کو ہم نے عالم پر فضیلت دی اور ان کو ہدایت بخشی ۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے : اولئك الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ (الانعام ۹۰) دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ ایک ہی میثاق نبوت ہے جو حضرت محمد ، نوح ، ابراہیم ، موسٰی ، عیسٰی اور تمام پیغمبروں سے لیا گیا ۔ یہ میثاق اس بات کا تھا کہ لوگوں کے سامنے حقیقت آخرت کو پوری طرح کھول دیا جائے تاکہ کوئی شخص بھی آنے والے نازک مرحلۂ حیات سے بے خبر نہ رہے ۔ پھر جو کوئی تصدیق کرے وہ اپنی تصدیق کا ابدی انعام پائے اور جو منکر بنا رہے وہ اپنے انکار کی ابدی سزا بھگتے ۔ احزاب ۸ ۔ ۷)

اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی مشترک پیغمبرانہ مشن ہے جس کے لئے ہر نبی کو کام کرنا ہے ۔ اب اگر گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر نبی کے یہاں کچھ چیزیں مشترک ہیں اور کچھ چیزیں غیر مشترک ۔ مثلاً حضرت ابراہیم کا اپنے بیٹے کو ذبح کرنا ، حضرت نوح کا کشتی بنانا ۔ حضرت موسٰی کا ید بیضا کا معجزہ دکھانا ۔ حضرت سلیمان کا ہوا میں اڑنا ۔ حضرت یوسف کا مسائل قحط کو حل کرنا ۔ حضرت یحییٰ کا قتل ہو جانا ۔ حضرت مسیح کا مردہ کو زندہ کرنا ۔ ان میں سے ہر چیز ہر نبی کے یہاں الگ الگ ہے ۔ کوئی نبی اس میں ایک دوسرے کے ساتھ مشترک نہیں ہے ۔ انھیں غیر مشترک چیزوں میں حکومت کا قیام بھی ہے ۔ کیوں کہ وہ بعض پیغمبروں کے یہاں پایا جاتا ہے مگر اکثر کے یہاں نہیں پایا جاتا ۔

اب اگر فبھداھم اقتدہ کا مطلب یہ لیا جائے کہ ایک پیغمبر دوسرے پیغمبروں کی تمام چیزوں کا اتباع کرے تو یہ نہ تو ممکن ہے اور نہ کسی پیغمبر نے کیا ۔ حتیٰ کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم جو نبی کامل ہیں ۔ انھوں نے بھی نہیں کیا ۔ مثلاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیٹے کو ذبح نہیں کیا ۔ آپ نے جنوں کو مسخر کر کے ان سے کام نہیں لیا ۔ آپ نے ید بیضا کا معجزہ نہیں دکھایا ۔ آپ نے مردوں کو زندہ نہیں کیا ۔ وغیرہ اسی طرح دوسرے نبیوں میں بیشتر وہ ہیں جنھوں نے جہاد بمعنی جنگ نہیں کیا ۔ اور حکومت قائم نہیں کی ۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ان آیات میں اتباع سے مراد مشترک امور میں اتباع ہے نہ کہ غیر مشترک امور میں اتباع ۔

ہدایت اور میثاق کا تعلق جب تمام نبیوں کے ساتھ یکساں ہے تو لامحالہ ہدایت اور میثاق کا ایسا

مفہوم لینا پڑے گا جو تمام نبیوں کے درمیان مشترک ہو، جو تمام پیغمبروں پر یکساں طور پر صادق آتا ہو نہ کہ کسی ایک پیغمبر پر۔ اس اصول کی روشنی میں جب نبوت اور کار نبوت کا مشترک پہلو تلاش کیا جائے تو وہ ایک ہی نکلتا ہے ـــــ اعلان آخرت، ایک ایک فرد پر یہ کوشش کرنا کہ وہ دنیا میں ربانی بن کر رہے۔ ورنہ آخرت میں اس کو ابدی عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہی ایک بات ہے جو تمام نبیوں کے درمیان مشترک ہے۔ اب اگر آدمی اس ایک بات کو اپنی زندگی میں بخوبی طور پر پکڑے اور دوسروں کو اس کی طرف بلائے تو یہ اقامت دین ہے اور اگر وہ اس ایک بات کے سوا کسی اور بات کو اشو بنا کر اس پر تحریک چلانے لگے تو یہ تفرق فی الدین (الشوریٰ ۱۳)

اس "مشترک دین" کے سوا جو چیزیں پیغمبروں کی زندگی میں ایک دوسرے سے مختلف ملتی ہیں وہ اضافی حیثیت رکھتی ہیں نہ کہ حقیقی۔ یعنی وہ دوسرے تقاضوں کے تحت کسی پیغمبر کی زندگی میں شامل ہوتی ہیں نہ کہ اس کے اصلی مشن کے تحت۔

حکومت والے پہلو کے بارہ میں اگر یہ کہا جائے کہ تمام نبیوں کا مقصد حکومت الٰہیہ کا قائم کرنا تھا۔ البتہ کچھ انبیا رکوشش کے درجہ میں رہ گئے اور کچھ آخری کامیابی کے درجہ تک پہنچے۔ تو یہ بات واقعہ کے مطابق نہ ہوگی۔

مثال کے طور پر حضرت موسیٰ کو لیجئے۔ اس انقلابی نظریہ کے دعویدار یہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کا مشن مصر میں سیاسی انقلاب برپا کرنا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت وقت کا تختہ الٹ دیں اور ملک کے حکمراں طبقہ کو سرزمین مصر کی فرماں روائی سے بے دخل کر کے ملک کے اقتدار پر قبضہ کریں اور پھر وہاں کے نظام کو بدل کر نئی بنیادوں پر سیاسی و معاشی و تمدنی انقلاب برپا کریں۔ مگر یہ بات سراسر غلط قرار پاتی ہے۔ کیوں کہ اگر حضرت موسیٰ کا مقصد یہی تھا تو فرعون اور اس کے لشکر کی غرقابی کے بعد مصر میں آپ کے لئے میدان صاف ہو چکا تھا اور وہاں حضرت موسیٰ اپنی "قیادت و فرماں روائی کی غیر معمولی قابلیت"، کو کام میں لا کر مطلوبہ سیاسی نظام قائم کر سکتے تھے۔ مگر اس کے برعکس یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ مردہ فرعون کے ملک کو چھوڑ کر صحرائے سینا میں چلے گئے۔ حضرت ابراہیم کا عراق چھوڑ کر جانا اگر اس لئے تھا کہ وہاں آپ کے لئے مواقع حکومت نہیں تھے تو حضرت موسیٰ کیوں مصر کو چھوڑ کر چلے گئے جہاں آپ کے لئے مکمل طور پر مواقع حکومت پیدا ہو چکے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبوت کے مشن کی یہ تعبیر سراسر بے بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قرآن سے کسی طرح ثابت نہیں ہوتی۔

الرسالہ (انگریزی)

الرسالہ (اردو) ۱۹۷۶ میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کا انگریزی اڈیشن فروری ۱۹۸۴ سے نکل رہا ہے اور ہر ماہ پابندی کے ساتھ خریداروں کے پاس پہنچ رہا ہے۔ الرسالہ کے ایک خریدار مسٹر جیت سنگھ لامبہ کے خط کا عکس مقابل کے صفحہ پر شائع کیا جا رہا ہے، یہ ان بہت سے خطوں میں سے ایک ہے جو برابر ہم کو مختلف حلقوں کی طرف سے موصول ہو رہے ہیں۔

مسلم دنیا میں بہت سے انگریزی رسالے اور اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ بظاہر ان کے نام مختلف ہیں۔ تاہم اگر مضامین کے اعتبار سے ان کا کوئی ایک مشترک نام رکھنا ہو تو وہ پروٹسٹ (احتجاج) ہوگا۔ ان جرائد کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان کے پاس اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف شکایت اور احتجاج کے سوا کوئی اور لکھنے کی چیز نہیں۔ انھوں نے نہ خدا کو پایا جس کی وہ کبریائی بیان کریں۔ ان کو نہ جہنم کی لپٹیں محسوس ہوئیں جس کی وہ دنیا کو خبر دیں۔ ان کو نہ جنت کے کسی جھونکے کا تجربہ ہوا جس کو وہ خدا کے بندوں تک پہنچائیں۔ ان کو بس ایک ہی چیز معلوم ہے۔ اور وہ مسلمانوں کے قومی مسائل ہیں اور وہ انھیں کو دہراتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں کے جرائد ساری دنیا میں ایک قسم کا احتجاج نامہ بن کر رہ گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک عام انسان کو اس میں پڑھنے کی کوئی چیز ملتی ہی نہیں۔ عام انسان جو اپنی فطرت کے زور پر سچائی کی تلاش میں ہے اس کو مسلمانوں کی قومی چیخ پکار سے کیا تعلق۔ نتیجہ یہ ہے کہ بظاہر اگرچہ مسلمانوں کے بہت سے انگریزی جرائد ساری دنیا میں نکل رہے ہیں مگر دین حق کے تعارف کے اعتبار سے ان کی کوئی افادیت نہیں۔

الرسالہ (انگریزی) مسلم دنیا میں غالباً پہلا رسالہ ہے جو لوگوں کے سامنے اسلام کا مثبت تعارف پیش کرتا ہے جو احتجاج اور شکایت سے بلند ہو کر انسان کو برتر سچائیوں کی طرف بلاتا ہے۔ جو انسان کی ابدی فطرت کا ترجمان ہے نہ کہ کسی قوم کے وقتی مسائل کا ترجمان۔

ایسے ایک پرچہ کا وجود میں آنا آپ پر زبردست ذمہ داری ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ اس کے ساتھ تعاون کریں۔ آپ اس کی ایجنسی لیں۔ آپ لوگوں کو اس کا خریدار بنائیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے آپ اپنی ساری طاقت لگا دیں۔

منیجر الرسالہ (انگریزی)

S. S. LAMBA
"LAMBA NIWAS"
K-123, Kirti Nagar
NEW DELHI-110 015

22.5.84.

Respected Maulana Saheb,

I am enclosing herewith a Cheque No. B-945694 of today's date for Rs. 36/- on account of yearly subscription of Al-Risala Monthly.

I am regularly receiving the copies of Al-Risala and have greatly benefited from your articles. Your remarkable contributions which have been undoubtedly added to my existing knowledge about Islam and the Holy Prophet, are really praiseworthy.

I congratulate you for your positive steps and contributions in bringing out Al-Risala in English which, I am sure, will be read by the people all over the world.

With respectful regards,

Yours sincerely,

(S. S. Lamba)

Maulana Waheed-ud-din Khan Saheb,
C-29, Nizamuddin West,
New Delhi-110013.

Encl: As above.

ایک سفر

۲۹ فروری ۱۹۸۴ کی صبح کو میں دہلی کی مسجد کی اذان پر فجر کی نماز کے لئے اٹھا تھا۔ اگلے دن یکم مارچ کی صبح کو میں مدینہ منورہ کے موذن کی اذان پر فجر کی نماز کے لئے اٹھا اور مسجد نبوی کے امام کے پیچھے "بین اقوامی جماعت" میں شریک ہو کر فجر کی نماز ادا کی۔

ہزاروں کیلومیٹر کا فاصلہ "راتوں رات" طے ہونے کا واقعہ بظاہر اتنا ہی عجیب ہے جتنا چودہ سو سال پہلے سبحان الذی اسری بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ کا واقعہ لوگوں کو عجیب معلوم ہوا تھا۔ مگر آج کا انسان چوں کہ تیز رفتار کاروں اور ہوائی جہازوں کے زمانہ میں ہے اس لئے ایسی خبر سن کر آدمی کے اوپر حیرانگی طاری نہیں ہوتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چودہ سو سال پہلے "اسرار" کا واقعہ بھی اتنا ہی غیر عجیب تھا جتنا موجودہ زمانہ کا واقعہ۔ آج کا "اسرار" جس نظام اسباب کے تحت ہوتا ہے وہ چونکہ انسان کے سامنے کھلا ہوا ہے اس لئے اس پر انسان کو حیرانی نہیں ہوتی۔ مگر چودہ سو سال پہلے کا "اسرار" جس نظام اسباب کے تحت ہوا تھا وہ انسان کی نظروں سے اوجھل تھا اس لئے انسان اس کو سمجھ نہ سکا۔ تاہم قیامت میں اس دوسرے نظام (خدائی نظام) سے پردہ ہٹ جائے گا۔ اس وقت انسان جان لے گا کہ اسرار خداوندی بھی اسی طرح عین ممکن تھا جس طرح آج اسرار مشینی بالکل ممکن نظر آتا ہے۔

"بیل گاڑی" کے دور میں انسان کے لئے "ہوائی جہاز" ایک ناقابل یقین چیز تھی۔ کیوں کہ اس وقت ہوائی جہاز مستقبل کے پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ اسی طرح موجودہ زندگی میں ابھی آخرت کا دور انسان کی نظروں سے چھپا ہوا ہے۔ پردہ ہٹنے کے بعد عالم غیب کی باتیں بھی آدمی کے لئے اسی طرح قابل فہم بن جائیں گی جس طرح عالم شہود کی باتیں آج قابل فہم بنی ہوئی ہیں۔

مدینہ کی موجودہ مسجد نبوی غیر معمولی پر وسیع اور عظیم ہے۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہوا تو اس کی عظمت میرے لئے خدائی عظمت کی علامت بن گئی۔ میرا دل بھر آیا اور بے اختیار زبان سے نکلا کہ خدایا، تو ہم پر رحم فرما اور ہم کو بخش دے۔ اگر تو رحم نہ کرے اور مغفرت نہ فرمائے تو یقیناً ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں ہو کر رہ جائیں گے۔ (وان لم ترحمنا وتغفرلنا لنکونن من الخاسرین)

میرا یہ سفر بڑے عجیب حالات میں ہوا۔ سفر سے صرف چند دن پہلے معلوم ہوا کہ میرے پاسپورٹ کی مدت ۶ مارچ کو ختم ہو رہی ہے۔ مزید یہ کہ پاسپورٹ پر ایف لکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ "فائنل" ہے۔ یعنی اب اس کی تجدید نہیں ہوگی۔ بلکہ حسب قاعدہ دوسرا پاسپورٹ از سر نو بنوانا ہوگا۔

اس کے علاوہ سفر میں چند چیزیں ساتھ لے جانی تھیں جو اب تک تیار نہ تھیں۔ مثلاً انگریزی الرسالہ (مارچ ۱۹۸۴) انگریزی میں تعارفی سٹ، مرکز کا تعارف نامہ وغیرہ۔ صرف چند دن کے اندر یہ سارے کام ہو جانا ضروری تھا۔ سعودی عرب ایئر لائنز نے دو ٹکٹ دیدئے۔ ایک میرے لئے اور ایک مولانا ہاشم القاسمی کے لئے۔ ۲۹ فروری کی صبح کے لئے ریزرویشن بھی کرالیا گیا۔ مگر ۲۸ فروری آگئی اور ابھی تک کام پورا نہیں ہوا تھا۔ یقین نہیں تھا کہ میرا سفر ہو سکے گا۔

۲۸ فروری کی صبح کو میں نے اپنے لڑکے ثانی اثنین کو کاموں کی فہرست دے کر گھر سے روانہ کیا۔ ثانی اثنین کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ اتنا سب کام صرف ایک دن میں کس طرح انجام پائے گا۔ رات کو واپس آکر ثانی اثنین نے بتایا کہ میں نظام الدین سے روانہ ہوا تو اجمیری گیٹ تک مجھ کو تمام چوراہوں پر گرین سگنل ملا۔ پہلی بار بالکل غیر معمولی طور پر ایسا ہوا کہ کسی ایک جگہ رکے بغیر میں سیدھا اجمیری گیٹ پہنچ گیا۔ اس واقعہ سے میری ہمت بندھی، مجھے یقین ہو گیا کہ ہمارے ساتھ اللہ کی مدد شامل ہے۔ اور ضرور تمام کام ہو جائے گا۔ چنانچہ رات تک حیرت انگیز طور پر سارا کام مکمل ہو چکا تھا۔ ایک ہفتہ کا کام صرف ایک دن میں مکمل ہو گیا اور میں حسب پروگرام ۲۹ فروری کو صبح ۱۰ بجے سعودی ایئر لائنز کی فلائٹ سے مدینہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے میرے پروگرام کی قطعی اطلاع الجامعۃ الاسلامیہ (مدینہ) کو نہیں دی جا سکی تھی۔ میری روانگی کے بعد ۲۹ فروری کی دوپہر کو جامعہ کے نام دہلی سے ٹیلکس کیا گیا جب کہ اسی دن شام کو میں مدینہ پہنچنے والا تھا۔ ظہران اور ریاض ہوتا ہوا مدینہ ایئر پورٹ پر پہنچا تو جامعہ کا نمائندہ وہاں معاونت کے لئے موجود تھا ——— موجودہ زمانہ میں مواصلات کی ترقی نے انسان کے لئے کس قدر آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس کے باوجود انسان خدا کا شکر ادا نہیں کرتا۔

مدینہ ایئر پورٹ سے ہم الجامعۃ الاسلامیہ کے نمائندہ کے ساتھ چلے۔ یہاں تک کہ ہم لوگ فندق النخیل میں پہنچا دئے گئے۔ یہاں ہمارا قیام کمرہ نمبر ۹۰۱ اور ۹۰۲ میں تھا۔ اگلے دن ہم الجامعۃ الاسلامیۃ لے جائے گئے۔ وہاں رئیس الجامعۃ ڈاکٹر عبد اللہ صالح العبید اور دوسرے ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی۔ عرب لوگ ملاقات کے وقت دعائیں بہت دیتے ہیں۔ یرحمکم اللہ، یحییکم اللہ جیسے کلمات کی فضا میں ملاقاتیں ہوئیں۔ رئیس الجامعۃ بار بار فرصۃ طیبۃ، فرصۃ طیبۃ کہتے رہے۔ ذمہ داروں کے مشورے کے بعد محاضرات کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ اس سلسلے میں ذمہ داروں کی طرف سے اخبار میں بھی اعلان شائع کر دیا گیا۔ جامعہ کے شائع کردہ سرکلر کا عکس مقابل صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔

الجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة
عمادة شئون الطلاب

" بسم الله الرحمن الرحيم "

برنامج لقـــــاءات

الشيخ وحيد الدين خان بمنسوبى الجامعـــة

=======

تستضيف الجامعة المفكر الاسلامى المعروف الشيخ وحيد الدين خان .. وتنظم لــه

عدة لقاءات مع منسوبى الجامعة كالآتى :ـ

اليوم والتاريخ	الوقـــت	المكـان	موضوع المحاضرة
الأحد ٢/٦/١٤٠٤	بعد المغرب	قاعة المحاضرات	الاسلام والانسان المعاصر
الاثنين ٣/٦/١٤٠٤	" "	مسجد الجامعة	الاسلام والمشاكل العصرية
الثلاثاء ٤/٦/١٤٠٤	" "	قاعة المحاضرات	التضامن والدعوة الاسلامية
السبت ٨/٦/١٤٠٤	" "	صالة الـــدور الثالث بمهجع ب	امكانيات جديدة للدعـــوة الاسلامية
الأحد ٩/٦/١٤٠٤	" "	قاعة المحاضرات	حوار مفتوح

والدعوة عامة للجميـــع .

والله الموفـــــق ...

عميد شئون الطلاب

٦/١

د . احمد بن سعد حمدان الغامدى

مدینہ کا یہ سفر الجامعۃ الاسلامیۃ (مدینہ منورہ) کی دعوت پر ہوا۔ جمادی الاول ۱۴۰۴ھ میں جامعہ میں المؤتمر الثانی للدعوۃ الاسلامیۃ کا اجلاس ہوا۔ جس میں دنیا کے مختلف حصوں سے دعاۃ اور اہل علم بلائے گئے تھے۔ مجھے بھی اس موتمر میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ مطبوعہ پروگرام میں میرا نام شامل کیا جا چکا تھا۔ مگر اس وقت میں بعض اسباب کی بنا پر سفر نہ کرسکا۔ تاہم جامعہ مجھ کو بلانا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے ایک ہفتہ کا مستقل پروگرام بنایا جس میں جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ سے ملاقاتیں تھیں اور ہر روز شام کو جامعہ میں میرا ایک محاضرہ (لکچر) رکھا گیا تھا۔ اس پروگرام کے تحت یہ سفر ہوا۔ مولانا محمد ہاشم القاسمی کے ہمراہ یکم مارچ کو مدینہ پہنچا۔

ظہران کے ہوائی اڈہ پر جہاز اترا تو اعلان کیا گیا کہ تمام مسافر، خواہ وہ ظہران سے آگے جا رہے ہوں یہاں اتریں اور کسٹم پر جاکر معائنہ کرائیں۔ اس قسم کی غیر معمولی چیکنگ ان سیاسی مجاہدین کی نادانیوں کی قیمت ہے جو وہ اسلام کے نام پر موجودہ زمانہ میں کر رہے ہیں۔ اسلام انسانوں کے لئے رحمت بن کر آیا تھا مگر اسلام کے نادان دوستوں نے اس کو انسانوں کے لئے زحمت بنا دیا ہے۔ ظہران کے ہوائی اڈہ پر ہماری کتابیں اور کاغذات کسٹم والوں نے بے رحمی کے ساتھ نکال کر بکھیر دئے۔ ان کو ہر لٹریچر پر "باغیانہ لٹریچر" کا شبہہ ہوتا ہے۔ اتنے میں شیخ محمد یونس نجرامی آگئے جو یہاں مراقب المطبوعات ہیں، وہ مجھ کو جانتے تھے۔ انھوں نے اسٹاف کے لوگوں سے کہا کہ ھو من کبار علماء الہند۔ اس کے بعد انھوں نے ہم کو چھوڑ دیا۔

۲ مارچ کو جامعہ کے بڑے ہال میں پہلا محاضرہ تھا۔ اصل محاضرہ عربی میں تھا اور اس کا موضوع تھا: التضامن والدعوۃ الاسلامیۃ۔ وسیع ہال بھرا ہوا تھا۔ ابتدائی کارروائی کے بعد میں نے مقالے کے چند صفحات پڑھے اور پھر یہ کہہ کر اس کو مولانا صفی احمد صاحب کو دے دیا اور انھوں نے بقیہ صفحات پڑھ کر مقالہ کو مکمل کیا۔ سیوالی القرأۃ انشاء اللہ اخی الفاضل صفی احمد نیابۃً عنی وبید اللہ التوفیق

۳ مارچ کو جامعہ کی مسجد میں پروگرام تھا۔ یہ مسجد بہت بڑے ہال کی مانند ہے اور انتہائی سادہ ہوتے کے باوجود انتہائی شاندار ہے۔ یہ دوسرا محاضرہ انگریزی میں تھا۔ میں نے اصل انگریزی محاضرہ کا کچھ حصہ بطور خلاصہ پڑھا اور اس کے بعد کہا:

هذه خلاصة مقالتي وسيلقيها مفصلة باللغة العربية فضيلة الاستاذ محي الدين العربي۔

محی الدین عربی ایک مصری عالم ہیں۔ انھوں نے پہلے سے میرے انگریزی مقالہ کا عربی ترجمہ تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ

انھوں نے مکمل ترجمہ خالص عربی لہجہ میں پڑھ کر سنایا۔

۴ مارچ کو دوبارہ جامعہ کے بڑے ہال (قاعة المحاضرات) میں پروگرام تھا۔ محاضرہ کا عنوان تھا: امکانیات جدیدۃ للدعوۃ۔ یہ مقالہ عربی میں تھا۔ میں نے خود پورا مقالہ پڑھ کر سنایا۔ بعد کو لوگوں نے کہا کہ آپ کے پڑھنے کا طریقہ بہت اچھا تھا۔ اور آئندہ آپ کو اپنا مقالہ خود ہی پڑھنا چاہئے خواہ وہ عربی میں ہو یا انگریزی میں۔

اس کے بعد تین دن کا وقفہ تھا۔ اگلا پروگرام ۱۱ مارچ کو دن میں ہوا۔ اصل مقالہ انگریزی میں تھا۔ میں نے ابتداءً کچھ کلمات خلاصہ کے طور پر کہے۔ اس کے بعد محی الدین عربی نے اس کا مکمل عربی ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ شام کو نماز مغرب کے بعد حوار مفتوح (سوال وجواب) کا پروگرام تھا۔ میں نے تمہید کے طور پر کچھ ابتدائی کلمات عربی میں کہے۔ اس کے بعد طلبہ کے سوالات کاغذ پر لکھے ہوئے آنا شروع ہوئے۔ کافی سوالات آئے اگرچہ بعض سوالات میرے ذوق کے خلاف تھے۔ تاہم میں نے تمام سوالات کے جوابات دئے۔ اس کی شکل یہ ہوئی کہ ایک ایک سوال پڑھ کر سنایا جاتا اور میں اس کا جواب دیتا۔

یہ مجلس کافی دلچسپ رہی۔ لوگ آخر تک نہایت دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے۔ اساتذہ اور ذمہ داروں کی بھی ایک تعداد ہال کے اندر تھی۔

۶ مارچ کی شام کو نماز عشا کے بعد جامعہ اسلامیہ کے ہندستانی طلبہ بڑی تعداد میں ہوٹل کے کمرہ میں آگئے۔ ان کی خواہش پر میں نے بتایا کہ میرا اصل مطالعہ کیا ہے اور میں نے اب تک کے مطالعہ سے کیا پایا ہے۔ یہ گفتگو زیادہ اسلامی دعوت کے جدید امکانات کے پہلو پر تھی۔ اس مجلس میں جامعہ کے بعض استاد بھی شریک تھے۔ مزید میں نے کہا کہ سورہ یوسف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی دنیا میں یہ بھی ممکن ہے کہ جہاں لوگ آپ کی تاریخ ختم کرنا چاہتے ہوں وہاں سے آپ کے لئے ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو جائے۔ آپ کا اسوراالقصص احسن القصص میں تبدیل ہو جائے۔ مگر اس عظیم خدائی انعام کو پانے کی دو لازمی شرطیں ہیں۔ تقویٰ اور صبر (یوسف ۹۰)

۷ مارچ کی شام کو ایک صاحب کے مکان پر ہندستانی طلبہ کا اجتماع ہوا۔ یہاں میں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا کہ "مومن" ہونے کا مطلب کیا ہے اور جنت میں داخلہ آدمی کو کس طرح ملے گا۔ آخر میں کچھ لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ اپنے مرکز کے مقاصد کے بارہ میں کچھ بتائیں۔ اس سلسلے میں میں نے ضروری تفصیلات عرض کیں۔

مجھ کو ایک عجیب تجربہ یہ ہوا کہ اگر الاسلام یتحدی کی قسم کی سائنس والی باتیں کی جائیں تو لوگ خوب خوش

ہوتے ہیں اور ھل من مزید کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر حمد خداوندی کی باتیں کی جائیں اگر جنت اور جہنم کا تذکرہ کیا جائے۔ اگر رزق ربانی کے نغمے چھیڑے جائیں تو لوگوں کو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلا اسلام ان کی پہچان والا اسلام ہے۔ جب کہ دوسرا اسلام ان کی پہچان والا اسلام نہیں۔ آج مسلمانوں نے اسلام کو اپنے لئے سرمایہ فخر بنا رکھا ہے۔ اس لئے پہلی قسم کی باتیں ان کو اسلام کا سائنسی قصیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کو سن کر ان کی نفسیاتِ فخر کو تسکین ملتی ہے اور وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ مگر دوسری قسم کی باتیں ان کو اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ کیوں کہ اسلام کے نام سے وہ اس قسم کی کسی چیز کو جانتے ہی نہیں۔ اسلام ان کے لئے قومی فخر کا عنوان ہے نہ کہ اصلاحِ ذات کا عنوان۔ فخر والی بات کی جائے تو وہ اس میں اپنے لئے غذا پا لیتے ہیں۔ مگر اصلاح ذات والی باتیں کی جائیں تو وہ اس سے متوحش ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا مطلب اپنی نفی ہے۔ اور کون ہے جو اپنی نفی کی قیمت پر حق کا اعتراف کرے

رابطہ عالم اسلامی کے ہفتہ وار الدعوۃ (الریاض) مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۴ میں شائع شدہ رپورٹ یہاں نقل کی جاتی ہے:

وحيد الدين خان في الجامعة الاسلاميه

المدينة المنورة / مندوب الدعوة ــــــ ضمن الموسم الثقافي والذي تنظمه عمادة شئون الطلاب بالجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة۔ استضافت الجامعة الداعية الاسلامي الشيخ وحيد الدين خان، احد كبار علماء الهند والذي يزور الجامعة حاليًا، حيث القى اربع محاضرات خلال الاسبوع الماضي۔ هذا وقد انهى الشيخ وحيد الدين محاضراته بحوار مفتوح مع طلبة الجامعة۔

سعودی عرب کے ماہنامہ الفیصل (ریاض) میں ایک کالم الحركة الثقافية في الوطن العربي کے عنوان سے ہوتا ہے۔ مذکورہ جریدہ کی اشاعت شعبان ۱۴۰۴ھ (مئی ۱۹۸۴ء) میں صفحہ ۱۳۱ پر جو رپورٹ درج ہے وہ یہاں نقل کی جاتی ہے:

محاضرات

۱ الاسلام المعاصر۔ محاضرة القاها الشيخ وحيد الدين خان، وذلك بالجامعة الاسلامية (المدينة المنورة)

۲ الاسلام والمشاكل العصرية ـ محاضرة القاها الشيخ وحيد الدين خان بالجامعة الاسلامية

۳ التضامن والدعوة الاسلامية ـ محاضرة القاها الشيخ وحيد الدين خان بالجامعة الاسلامية

٤ امکانات جدیدة للدعوة الاسلامیة ـ محاضرة القاها الشیخ وحید الدین خان وذالك بالجامعة الاسلامیة بالمدینة المنورة

والجدیر بالذکر ان هذه المحاضرات الاربع قد القاها فضیلته خلال شهر جمادی الاخرة ۱۴۰٤ھ وذالك خلال زیارته للجامعة

۴ مارچ کو ایک صاحب عبد القادر النماری (الجزائر) نے انٹرویو لیا۔ وہ اخبار المدینہ کے نمائندہ تھے۔ انھوں نے ایک کاغذ پر بہت سے سوالات لکھ رکھے تھے۔ میں نے کچھ سوالات کے جوابات دئے اور کچھ اختلافی نوعیت کے سوالات کے جوابات سے معذرت کی۔ میں نے دیکھا کہ میرے جوابات کے بعد دو بارہ وہ نئی شق نکال کر سوال نہیں کرتے تھے۔ اور میری معذرت فوراً قبول کر لیتے تھے۔

عبد القادر جزائری تبلیغی جماعت سے متاثر ہیں اور کسی جماعت کے ساتھ دہلی (نظام الدین) بھی جا چکے ہیں۔ مجھے گفتگو کے دوران بار بار یہ تجربہ ہوا کہ تبلیغی جماعت کے افراد بحثوں میں نہیں الجھتے۔ اور نہ اختلافی امور میں زیادہ شدت ظاہر کرتے۔ یہ ان کے دینی مزاج کا ثبوت ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اسلام کی سیاسی تعبیر سے متاثر ہیں ان سے گفتگو کے دوران اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان کو سب سے زیادہ دلچسپی اختلافی امور سے ہے۔ کوئی بھی جواب انھیں چپ نہیں کرتا۔ ہر جواب کے بعد وہ ایک نیا لفظی شوشہ نکال کر نئی بحث شروع کر دیتے ہیں۔

تیونس سے ایک ماہوار رسالہ نکلتا ہے جس کا نام ہے جوہر الاسلام۔ پتہ یہ ہے:

جوہر الاسلام، ۲۸ نہج جمال عبد الناصر۔ تیونس (ٹیلی فون ۸۰۱ - ۲۵۹)

۴ مارچ کی شام کو جوہر الاسلام کے دو نمائندے آئے اور اپنے رسالہ کے لئے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات کچھ ہمارے مشن کے بارہ میں تھے اور کچھ موجودہ مسلم سیاست کے بارہ میں۔ میں نے اپنے مشن کے بارہ میں سوالات کے جوابات دئے۔ مگر موجودہ سیاست کے بارے میں جواب دینے سے اعراض کیا۔

روزنامہ عکاظ کے دو نمائندے ۱۱ مارچ کی شام کو میری قیام گاہ پر آئے۔ اور اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات بھی کچھ مرکز اسلامی کے بارہ میں تھے۔ اور کچھ عالم اسلام کے بارہ میں۔

المعہد العالی للدعوۃ الاسلامیۃ (مدینہ) کی طرف سے ایک ماہانہ پرچہ نکلتا ہے جس کا نام ہے رسالۃ المعہد اس کے نمائندہ محمد ضیاء الدین صاحب نے ۵ مارچ کی شام کو رسالۃ المعہد کے لئے انٹرویو لیا۔ محمد ضیاء الدین صاحب نوجوان ہیں اور حلب (شام) کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت وہ مدینہ میں وزارۃ الاعلام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ رسالۃ المعہد کے جوابات کا اردو ترجمہ یہاں بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ دعوت اسلامی کا مطلب میرے نزدیک دعوت الی اللہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں دعوت الی اللہ کو جو چیلنج درپیش ہے وہ میرے نزدیک الحادی فکر کا غلبہ ہے۔ اس لئے دعوت اسلامی کی راہ ہموار کرنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ دنیا سے الحادی فکر کا غلبہ ختم کیا جائے۔
قدیم زمانہ میں مادی مظاہر کو خدا قرار دے کر انسان نے خدا کو چھوڑ دیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں مادی مظاہر کے پیچھے کام کرنے والے سلسلۂ اسباب کو خدا قرار دے دیا گیا ہے اور اسی کا نام الحاد ہے۔ جب تک اس فکری ڈھانچہ کو توڑا نہ جائے کوئی دوسرا کام نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ موجودہ زمانہ کے داعیوں کا اصل مسئلہ وہ ہے جو داخلی ہے۔ وہ ابھی تک دعوت اور قومیت کو اور اسی طرح دعوت اور سیاست کو الگ الگ نہیں کر سکے ہیں۔ جس دن وہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے میں کامیاب ہوں گے اسی دن ان کے مسائل کے خاتمہ کا بھی آغاز ہو جائے گا۔

۳۔ صحافت یقیناً اسلامی دعوت کے لئے نہایت اہم ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ مسلمان ابھی تک صرف قومی صحافت کو جانتے ہیں، وہ عالمی صحافت کے میدان میں داخل نہیں ہوئے۔ عالمی صحافت کے لئے موضوعیت (Objectivity) لازمی طور پر ضروری ہے اور مسلمان موضوعیت سے محروم ہیں۔

۴۔ میری زندگی کسی "حادثہ" کے نتیجہ میں نہیں بنی۔ میں نے اسلامی علوم اور غیر اسلامی علوم کا تقریباً ۴۰ سال تک مطالعہ کیا ہے۔ میری شخصیت اسی مطالعہ کے ذریعہ بنی ہے۔

۵۔ جدید علمی انکشافات کو تفسیر قرآن میں استعمال کرنا میرے نزدیک عین درست ہے بشرط صرف یہ ہے کہ معیار اصلی قرآن ہو نہ کہ جدید انکشافات۔ یعنی جدید انکشافات کو قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے نہ کہ قرآن کو جدید انکشافات کی روشنی میں۔
علمی نظریات کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دور اول میں جب قرآن نے کہا کہ زمین و آسمان کی نشانیوں پر غور کرو تو انسان نے اپنی اس وقت کی معلومات کی روشنی میں زمین و آسمان پر غور کیا۔ آج بھی یہی ہوگا کہ انسان اپنی موجودہ معلومات کی روشنی میں آیات کون پہ غور کرے گا۔ اس کی وجہ سے نہ پہلے کوئی اعتقادی خرابی پیدا ہوئی اور نہ آج ہو سکتی ہے۔
حج کے زمانہ میں حرم میں جو غیر معمولی بھیڑ ہوتی ہے اس کو میں صرف حج کی خصوصیت سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ غیر حج کے زمانہ میں مسجد خالی رہتی ہوگی۔ مگر میں نے دیکھا کہ آجکل بھی نمازوں کے اوقات میں مسجد نبوی تقریباً پوری بھر جاتی ہے۔ اور جمعہ کے دن تو بڑی تعداد میں لوگ مسجد کے باہر نماز ادا کرتے ہیں

جیسا کہ حج کے زمانہ میں نظر آتا ہے۔

قدیم مسجد نبوی کے مقابلہ میں موجودہ مسجد نبوی بہت زیادہ بڑی ہو چکی ہے۔ پوری مسجد بڑے بڑے پایوں پر قائم ہے۔ پایوں کے اوپر خاص طرح کے نشانات اس کی توسیع کی تاریخ بتاتے ہیں۔ اندر کی طرف کچھ پایوں پر خاص طرح کے رنگ مسجد نبوی کے قدیم رقبہ کو بتا رہے ہیں۔ اس کے بعد کے پایوں پر دوسرے نقوش ہیں جو اس توسیع کو ظاہر کرتے ہیں جو حضرت عثمان کے زمانہ میں ہوئی۔ اس کے بعد اس توسیع کے نشانات ہیں جو ترک خلافت کے زمانہ میں کی گئی۔ اور اس کے بعد نسبتاً جدید طرز کی شاندار تعمیرات ہیں جو سعودی حکومت کے زمانہ میں کی گئی ہیں۔ اس کے باوجود جب نماز کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسجد اپنی تمام توسیع اور اضافوں کے باوجود بدستور ناکافی ہے۔

حرم میں نماز کے وقت امام کی آواز بہت صاف سنائی دیتی ہے، امام خواہ سجدہ میں ہو یا رکوع میں یا قیام میں۔ میں نے جاننا چاہا کہ یہاں لاؤڈ اسپیکر کا کیا انتظام ہے کہ ہر حال میں امام کی آواز مقتدیوں تک بالکل صاف پہنچتی رہتی ہے۔ ایک روز قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ امام کی جگہ پر کئی بہت اچھے قسم کے مائک لگے ہوئے ہیں۔ یہ مائک نیچے سے لے کر اوپر تک ہیں۔ چنانچہ امام خواہ سجدہ میں ہو یا رکوع میں یا قیام کی حالت میں، مائک ہر حالت میں اس کی پوری آواز پکڑ لیتا ہے۔

یہی انتظام موذن کے لئے بھی ہے۔ چنانچہ موذن جب اذان دیتا ہے تو اس کی آواز میلوں تک سنائی دیتی ہے۔ قدیم مسجد نبوی کی اذان اگر ایک فرلانگ تک سنائی دیتی ہوگی تو آج مشینی دور میں یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اس کی زبان سے نکلی ہوئی اللہ اکبر اور حی علی الفلاح کی آواز ایک سو فرلانگ کے دائرہ میں گونجے ——— تاریخ کے امکانات کہاں سے کہاں تک جا پہنچے ہیں۔

حرم کے بالکل قریب ٹھہرنے کی وجہ سے پانچوں وقت کی نمازیں حرم میں ادا کرنے کا موقع ملا۔ یہ نعمت مجھے خدا کے فضل سے دو بار ملی۔ پہلی بار حج کے موقع پر۔ دوسری بار موجودہ سفر میں۔ تاہم ایک چیز میرے لئے بڑی عجیب تھی۔ اور وہ تھا حرم میں خواتین اسلام کا اپنا "حق مساوات" وصول کرنا۔ حرم کا ایک بڑا حصہ صرف خواتین کے لئے مخصوص ہے۔ یہ حصہ عام طور پر بھرا رہتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس حصہ میں عام طور پر جماعت شروع ہونے سے پہلے خاموشی رہتی ہے۔ مگر جیسے ہی جماعت کی نماز شروع ہوتی ہے اس حصہ سے بچوں کے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ یہ آوازیں مسلسل جاری رہتی ہیں یہاں تک کہ جیسے امام سلام پھیر کر جماعت ختم کرتا ہے بچوں کے شور کی آوازیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ آجکل والدین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے زندہ کھلونا بنے

رہتے ہیں۔ چنانچہ خواتین جب نماز کے لئے حرم میں آتی ہیں تو بچوں کو لانا بھی ان کے لئے ضروری ہوجاتا ہے۔ نماز شروع ہونے سے پہلے بچے اپنے ماؤں کی گود میں ہوتے ہیں۔ جب نماز شروع ہوتی ہے تو پاس کی جگہ پر انھیں رکھ کر وہ نماز کے لئے کھڑی ہوجاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواتین جب نماز میں مشغول ہوتیں تو ان کے بچے اپنے کھلونے سے محروم ہوجاتے۔ اور اس بنا پر رونے چیخنے لگتے۔ نماز ختم ہوتے ہی فوراً انھیں اپنا کھلونا مل جاتا اور وہ دوبارہ چپ ہوجاتے۔

یکم مارچ کی شام کو مغرب سے کچھ پہلے میں مسجد نبوی چلا گیا۔ ہمارا ہوٹل (الیخیل) مسجد نبوی سے اتنا قریب تھا کہ تکبیر کی آواز بھی ہمارے کمرہ تک سنائی دیتی تھی۔ مسجد کے صحن میں بیٹھ کر میں سبز گنبد کو دیکھ رہا تھا جس کے نیچے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر ہے۔ اچانک ایسا محسوس ہوا گویا میں تصور کی سطح پر رسول خدا کے ساتھ مربوط ہوگیا ہوں۔ درمیان کا زمانی فاصلہ تھوڑی دیر کے لئے حذف ہوگیا۔ سبز گنبد میرے لئے ایک تاریخی تسلسل کی علامت بن گیا۔

اسلام میں بلاشبہ قبر پرستی نہیں ہے۔ مگر پیغمبر اسلام کی قبر کا ثابت شدہ حالت میں مدینہ میں موجود ہونا آپ کی تاریخی اعتباریت کا ایک پختہ نشان ہے۔ آدمی سبز گنبد کو دیکھ کر گویا ایک تاریخ کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے پیغمبر اسلام کی "پختہ" قبر کا موجود رہنا بھی اسلام کی ایک استثنائی ضرورت ہے۔

یکم مارچ کی صبح کو ایک بار میں دسویں منزل سے اپنے کمرہ سے نیچے اترا۔ واپسی کے وقت معلوم ہوا کہ بجلی فیل ہوگئی ہے اور لفٹ کام نہیں کر رہی ہے۔ نیچے گراؤنڈ فلور پر بہت سے لوگ بجلی کی آمد کے انتظار میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ بظاہر دماغ میں یہ تھا کہ اب ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ بجلی کے آنے کا انتظار کریں۔ کیوں کہ "دسویں منزل" تک سیڑھیوں کے ذریعہ چڑھ کر پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔

"آئیے کچھ ورزش کریں" اچانک مولانا محمد ہاشم القاسمی نے کہا۔ میں سمجھا کہ شاید وہ کہہ رہے ہیں کہ یہاں بیٹھے رہنے کے بجائے ہم لوگ تھوڑی دیر کے لئے باہر کہیں ٹہل لیں۔ مگر جلد ہی معلوم ہوا کہ وہ سیڑھیوں کے ذریعہ چل کر اوپر جانے کی بات کر رہے تھے۔ میں فوراً آمادہ ہوگیا اور ہم دونوں سیڑھی کے ذریعہ اوپر چڑھنے لگے۔ چند منٹ گزرے تھے کہ میں اپنی منزل پر کمرہ نمبر ۹۰۱ میں داخل ہوچکا تھا۔ ہر کام جو بظاہر مشکل یا ناممکن نظر آتا ہے۔ وہ یقینی طور پر ممکن اور آسان ہے، بشرطیکہ ہمت کرکے اس کو شروع کر دیا جائے۔

ہندستان میں اگر کسی کی موت ہو اور اس کو نماز جنازہ کے لئے مسجد میں لایا جائے تو فرض نماز

کے بعد اعلان ہوگا" جنازہ تیار ہے" یہاں حرم میں اکثر کوئی نہ کوئی جنازہ ہوتا ہے اور نماز کے بعد اس کے لئے نماز کا اعلان ہوتا ہے۔ مگر اعلان کے الفاظ اس قسم کے ہوتے ہیں:

الصّلوٰۃ علی الرجل یرحمکم اللہ ، الصلوٰۃ علی المرأۃ یرحمکم اللہ ، الصلوٰۃ علی الطفل یرحمکم اللہ

عربی زبان کا یہ انداز اسلام کی دین ہے۔ اسلام کی چھاپ عربی زبان پر اتنی زیادہ ہے کہ وہ اس کے تمام اسالیب سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک دن ہمارے ایک ساتھی نے کمرہ کا ٹیلی وژن کھولا تاکہ سعودی عرب کی خبریں سن سکیں۔ اس وقت اتفاق سے ملک فہد کی ایک تقریر کا کچھ حصہ نشر کیا جا رہا تھا۔ ملک فہد کی تقریر میں بار بار اسلامی کلمات ادا ہو رہے تھے۔ شلاً ایک موقع پر انھوں نے سنجیدہ لہجہ میں کہا:

ونرجوا ربنا عز وجل ان یساعدنا۔۔۔

ایک روز ایسا ہوا کہ حرم میں کوئی صاحب مل گئے۔ اور ان سے بات کرتے ہوئے میں فرش پر بیٹھ گیا جہاں میں بیٹھا وہ اتفاق سے راستہ تھا۔ ایک عرب جو چاہتے تھے کہ میں راستہ سے ہٹ جاؤں تاکہ لوگوں کو نکلنے میں آسانی ہو، انھوں نے کہا،

خل الطریق للناس یرحمک اللہ

عربی زبان کا یہ انداز اس لئے ہے کہ اس کا نشو ونما اسلام کی روایات میں ہوا اس کے برعکس اردو کا نشو ونما بالکل دوسرے حالات میں ہوا۔ چنانچہ مدینہ کے ایک ہندستانی طالب علم نے ایک ملاقات کے موقع پر سوالیہ انداز میں کہا:

الرسالہ کا تو کوئی دفتر نہیں ہوگا۔ وہ جمعیۃ بلڈنگ کے کمرہ میں ہوگا۔

میں نے یہ جملہ سنا تو میری زبان سے نکلا " الرسالہ کا دفتر زمین وآسمان میں ہے۔"

عربوں کے ذہن پر عام طور پر سب سے زیادہ جو مسئلہ سوار ہے وہ یہود کا مسئلہ ہے۔ وہ یہودیوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ ایک عرب مصنف کے قلم سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے ـــــ الیہود وراء کل جریمۃ (تمام جرائم کے پیچھے یہودی ہیں) ایک تعلیم یافتہ عرب سے بات ہو رہی تھی تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ آج دوبارہ ہم کو ایک صلاح الدین ایوبی کی ضرورت ہے۔ ایک مقام پر مجھے کچھ اہل علم کی مجلس میں اظہار خیال کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ آجکل دنیا بھر کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک قسم کے احساس مظلومی Persecution Complex میں مبتلا ہیں۔ کہیں یہودی ان کو اپنے اوپر ظلم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کہیں غیر یہودی۔ یہ کسی قوم کے لئے نہایت بری علامت ہے۔ قومیں احساس یافت پر اٹھتی ہیں نہ کہ احساس محرومی پر۔ قرن اول میں جو لوگ مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ گئے۔ وہ موجودہ

زمانہ کے مسلمانوں سے زیادہ بڑے ظلم سے دوچار تھے۔ مگر شاہ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیار نے جو تقریر کی اس میں وہ "کھونے" کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ "پانے" کا ذکر کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو اگر دوبارہ اٹھانا ہے تو ان کے اندر بھی یہی ذہن پیدا کرنا ہوگا۔

ایک غیر عرب سے ملاقات ہوئی۔ وہ عالم تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ قرآن پر ایک تحقیقی کتاب لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ قرآن کے مطالعہ میں گزارا ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اپنے مطالعہ کی روشنی میں بتائیے کہ قرآنی تعلیمات کا خلاصہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: "اس حیثیت سے میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ میرے لئے یہ سوال اچانک ہے۔ اس لئے مجھے سوچ کر بتانا ہوگا۔" اسی طرح ایک اور صاحب ملے انھوں نے کہا کہ میرا موضوع قرآن ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی ایسی بات بتائیے جو آپ نے خود قرآن میں پائی ہو، جو آپ کی اپنی دریافت ہو۔ مگر وہ قرآن میں کسی خود دریافت کردہ حقیقت کی نشاندہی نہ کر سکے ——— کیسے عجیب ہوں گے وہ قرآن کو پڑھنے والے جن کے ذہنی اثاثہ خانہ میں قرآن نے کسی نئی چیز کا اضافہ نہ کیا ہو۔

اس سفر کے دوران ایک عرب ملک کی ایک بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ عرب امام نے کافی لمبا خطبہ دیا۔ اس خطبہ میں "بیع" کے مسائل نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے تھے۔ تاہم ان مسائل میں اکثر ایسے تھے جن کا آج کے حالات سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ بس کتاب کی باتوں کو دہرائے چلے جارہے ہیں۔

مثلاً انھوں نے کہا کہ جو لوگ مسلمانوں سے جنگ کریں ان کو ہتھیار بیچنا حرام ہے (بیع السلاح علی من یحارب المسلمین حرام) یہ مسئلہ صلیبی جنگوں کے زمانہ کا ہے۔ اس زمانہ میں عراق و شام کے علاقہ میں دنیا کے بہترین ہتھیار بنتے تھے۔ چنانچہ جنگ کے وقفوں میں یورپی تاجر یہاں آکر ہتھیار خریدتے تھے۔ چوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ یہ ہتھیار وہ یورپی قوموں کے ہاتھ بیچیں گے اور وہ ان کو اگلی صلیبی جنگ میں مسلمانوں کے خلاف استعمال کریں گے۔ اس لئے اس وقت کے علماء نے فتویٰ دیا کہ جو لوگ مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں ان کو ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے۔

یہ مسئلہ خود بتاتا ہے کہ وہ ایسے وقت سے متعلق ہے جب کہ مسلمان ہتھیار فروخت کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ مگر موجودہ زمانہ میں تو مسلمان صرف اس کے خریدار ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج ہتھیاروں کی صنعت پوری طرح "کافروں" کے ہاتھ میں جا چکی ہے۔ اور خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ ان سے ہتھیار خریدے بغیر اپنے دشمنوں سے اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ ہمارے اکثر بڑے بڑے خطیبوں کا یہ حال

ہے کہ جب وہ بولتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ " وہ بیسویں صدی میں نہیں بول رہے ہیں بلکہ " صلاح الدین کے منبر" پر کھڑے ہو کر اقوام عالم کو خطاب کر رہے ہیں۔

۵ مارچ کو دوپہر کا کھانا رئیس جامعۃ اسلامیہ دکتور عبد اللہ صالح العبید کی طرف سے تھا۔ انھوں نے میرے اعزاز میں مدینہ کے ہوٹل میں ظہرانہ دیا۔ اس ظہرانہ میں چنی ہوئی اعلیٰ شخصیتیں موجود تھیں جن میں وزارت تعلیم کے وکیل بھی تھے۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے ایک خصوصی دعوت کی جس میں رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل کے پی اے استاد اسامہ خلیفہ بھی شریک تھے۔

ان مواقع پر ذمہ دار لوگوں سے باتیں ہوئیں۔ شیخ محمد عمر فلاتہ سے اسلامی مرکز کے موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہم سیاست سے دور رہ کر خالص دعوت کے میدان میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں میری زبان سے نکلا کہ ہندستان کے حالات میں موثر کام کرنے کے لئے سیاست سے دور رہنا ضروری ہے۔ شیخ محمد عمر فلاتہ نے فوراً کہا کہ ہندستان ہی میں نہیں بلکہ ہر ملک میں ضروری ہے۔ سیاست میں مشغول ہو کر کوئی موثر کام نہیں کیا جاسکتا۔

پچھلے برسوں میں سیاسی اسلام کا ذوق اتنا بڑھا کہ اسلامی دعوت کو سیاسی دعوت کے ہم معنی بنا دیا گیا۔ جہاد غیر مسلموں سے مقابلہ کے لئے تھا۔ انھوں نے جہاد کو مسلمانوں کی باہمی جنگ کا عنوان بنا لیا۔ مگر عملی تجربہ نے اس کو ناکام ثابت کر دیا۔ چنانچہ عالم اسلام میں اب وہ دور شروع ہو گیا ہے جو بالآخر اس فکر کو بالکل بے قیمت بنا کر رکھ دے گا۔ اس سفر میں میری ملاقات ایک عرب قائد سے ہوئی۔ وہ پہلے سیاسی اسلام کے داعی تھے۔ اب وہ اس کو ترک کر چکے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اسی کو صحیح اسلام سمجھتا ہوں۔ اور پچھلے ۲۰ سال سے اس کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ جس فکر پر آپ ۲۰ سال پہلے پہنچ گئے تھے، ہم اس پر صرف ایک سال پہلے پہنچے ہیں۔

رئیس الجامعہ دکتور عبد اللہ صالح العبید سے میں نے پوچھا کہ آپ نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کس نے نہیں پڑھی ہے۔ اکثر لوگ مجھ سے یہ پوچھتے کہ الاسلام یتحدی کے بعد دوسری تصنیفات کیا ہیں اور وہ عربی میں منتقل ہوئیں یا نہیں۔

یہاں جس جگہ بھی جانا ہوا جس سے بھی ملاقات ہوئی اس نے یہی بتایا کہ اس نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے۔ بعض نے کہا کہ میں نے اس کے بارہ میں بہت کچھ سنا ہے۔ اور اس کو پڑھنا چاہتا ہوں۔ الجامعۃ الاسلامیۃ میں انڈونیشیا کے ایک طالب علم نے بتایا کہ انڈونیشی زبان میں بھی الاسلام یتحدی کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے میرا پتہ لیا اور کہا کہ اس کا ایک نسخہ میں آپ کو ڈاک سے روانہ کروں گا۔

شیخ محمد عمر فلاتہ ۲ مارچ کو ہوٹل میں ملنے کے لئے آئے۔ اتفاق سے میں موجود نہ تھا تو حسب ذیل تحریر چھوڑ گئے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

فضيلة الشيخ ضياء الدين حامد حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد

حضرت للتشرف بالسلام عليكم

بعد صلاة الجمعة فلم أسعد بلقائكم

وسأحضر مرة أخرى إن شاء الله

وأشكر هذا السرور الحال. وأتمنى أن

يكلل الله مساعيكم بالنجاح والتوفيق

محبكم

عمر محمد فلاتة

١٤٠٢/٦/٢

۱۰ مارچ کی شام کو شیخ محمد عمر فلاتہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے الجامعۃ الاسلامیۃ کے بعض عجیب واقعات سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ میں جامعہ کے تحت ایک سفر کے دوران کیمرون گیا۔ وہاں جامعہ کے ایک فارغ طالب علم سے ملاقات ہوئی تو وہ بار بار جامعہ کے ایک مستخدم (ملازم) کے بارہ میں سوال کرتا اور اس کا حال پوچھتا۔ میں نے پوچھا کہ تم جامعہ کے شیوخ سے زیادہ مستخدم کے حالات دریافت کر رہے ہو، کیا بات ہے۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ میں تعلیم کی غرض سے جامعہ گیا۔ میں اپنے ساتھ کوئی رقم نہیں لے گیا تھا۔ کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ ساری کفالت جامعہ کی طرف سے ہوگی۔ جب وہ مدینہ کے ایر پورٹ پر اترا تو اس کو یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ وہاں کوئی گاڑی اس کی مدد کے لئے موجود نہیں ہے۔

نوجوان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ٹیکسی کرے۔ اگرچہ اس کی جیب میں کوئی رقم موجود نہ تھی۔ تاہم اس نے ٹیکسی کی اور اس کے ذریعہ ایر پورٹ سے جامعہ پہنچا۔ یہاں جب ٹیکسی والے نے کرایہ (پندرہ ریال) مانگا تو نوجوان نے کہا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس پر ٹیکسی والا غصہ میں آگیا۔ اور نوجوان کو دھوکہ باز، شیطان وغیرہ کہنے لگا۔

نوجوان بے بسی کے انداز میں ٹیکسی والے کی سخت کلامی کو سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے میں جامعہ کا ایک مستخدم شور سن کر وہاں آگیا اور ٹیکسی والے سے کہا کہ تم کیوں اس طالب علم کو پریشان کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ یہ دھوکے باز ہے۔ مجھ کو ایر پورٹ سے لایا اور اب کرایہ دینا ہے تو کہتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں۔ مستخدم نے کہا کہ اپنی زبان روکو، یہ ضیوف الرحمن ہیں اور یہ مجھ سے اور تم سے بہت زیادہ بہتر ہیں۔

اس کے بعد مستخدم نے اپنی جیب سے پندرہ ریال نکالے اور اس کو ٹیکسی کے مالک کے حوالے کیا۔ اس کے بعد یہ مستخدم نوجوان کو لے کر دفاتر میں گیا۔ ضروری کارروائی کرائی اور اس کے سامان کو اس کے کمرہ تک پہنچایا۔ آخر میں جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس نے دوبارہ اپنی جیب سے ۲۰ ریال نکالے اور طالب علم کے حوالہ کر کے باہر چلا گیا۔

ایک ہندستانی طالب علم سے میں نے عربوں کے بارہ میں ان کے تجربات پوچھے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے عربوں میں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ ان کے اندر توسع کا مزاج ہوتا ہے جو ہندستان اور پاکستان جیسے علاقوں میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ ہم لوگ کسی محفل میں ایک تقریر کرتے ہیں یا کسی موقع پر ایک سوال کا معمولی جواب دیتے ہیں تو ہمارے اساتذہ فراخ دلی کے ساتھ احسنت احسنت کہتے ہیں۔ ان کا مزاج ہوتا ہے کہ جو خوبی ہے اس کا بھرپور اعتراف کیا جائے اور جو کمی ہے اس کو نظر انداز

کیا جائے۔

بیرونی ممالک کے سفروں میں بار بار مجھ کو اس کا تجربہ ہوا کہ میرے جیسی شکل وصورت کے آدمی کو "ہندستانی" ہونے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی ملک میں ہندستانی کی تصویر اچھی نہیں۔

مدینہ میں ہم جس ہوٹل میں ٹھہرائے گئے وہ یہاں کے معیار کے مطابق درجہ اول کا ہوٹل تھا تاہم عملہ کا رویہ ابتدائً کچھ زیادہ اچھا نہ تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انھوں نے ہم کو بس ایک "ہندستانی مسلمان" سمجھا۔ اس کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ شیوخ واکابر مجھ سے ملنے کے لیے آرہے ہیں۔ جامعہ کے مہمانوں کے لئے یہاں قیام وطعام کے بعد صرف مقامی ٹیلی فون کی سہولت ہوتی ہے مگر ہمارے لئے جامعہ اسلامیہ سے ہوٹل کو ہدایت دی گئی کہ "شیخ وحید الدین سعودی مملکت کے دوسرے شہروں نیز خارجی ممالک میں بھی ٹیلی فون کرسکتے ہیں اور یہ جامعہ کی طرف سے ان کے لئے خاص ہے"۔ (وهي خاصة للشيخ وحيدالدين من ادارة الجامعة) رئیس الجامعۃ (مدینہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر) نے اسی ہوٹل میں ہمارے اعزاز میں خصوصی ظہرانہ دیا اور آخر میں رخصت ہوتے ہوئے خود آگے بڑھ کر میرے لئے لفٹ کا بٹن دبایا۔ اس قسم کے واقعات کو دیکھ کر ہوٹل والوں کی روش خود بخود درست ہوگئی۔ وہ پہلے جتنا خشک تھے۔ اب وہ اتنا ہی ہمارے اوپر مہربان ہوگئے۔ ہوٹل کے منیجر نے خود ہمارے کمرہ میں آکر کہا کہ ہم ہر وقت آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ حتیٰ کہ اگلے دن تازہ پھل دو ٹرے میں رکھ کر ہمارے لئے بھیجے گئے۔ جس کے ساتھ خوبصورت کارڈ پر یہ لکھا ہوا تھا: مع تحياتنا لسيادتكم بطيب الاقامة

اوپر کی سطح پر اگر آپ کا اعتراف کرلیا جائے تو نیچے کی سطح کے لوگ خود بخود آپ کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

۵ مارچ کی صبح کو ہم دو فلسطینی نوجوانوں کے ساتھ مدینہ کے تاریخی آثار دیکھنے کے لئے نکلے۔ تقریباً نصف دن گزرا۔ مصطفیٰ شاور (فلسطینی ثم اردنی) کو آثار عرب کے بارے میں خاصی معلومات ہیں۔ چنانچہ وہ رہنمائی کرتے رہے۔ مدینہ میں رسول اللہؐ اور صحابہ کے زمانہ کے اصل آثار اب بہت کم باقی ہیں۔ ان آثار کی ایک حیثیت تاریخی تھی اور دوسری یہ تھی کہ لوگ ان کو مقدس قرار دے کر یہاں آکر مشرکانہ افعال کرتے تھے۔ ذمہ داروں نے ان کی دوسری حیثیت کی بنا پر انھیں ختم کردیا۔ اس وقت جو آثار ہیں ان میں اکثر وہ ہیں جہاں نئی تعمیرات کھڑی ہیں۔ مثلاً ایک شخص آپ کو بتائے گا کہ یہاں سقیفہ بنی ساعدہ تھا۔ مگر آج وہاں صرف کھجور اور درخت نظر آتے ہیں۔ مسجد الجمعہ اور مسجد قبا آج موجود ہیں مگر ان کی تعمیرات وہ نہیں ہیں جو ابتدا میں تھیں۔

تاہم کچھ چیزیں آج بھی اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہیں۔ مثلاً بیر رومہ جس کو حضرت عثمان نے ایک یہودی سے خرید کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کیا تھا۔ اسی طرح کعب بن اشرف کا قلعہ نما مکان بھی کھنڈر کی صورت میں ابھی تک موجود ہے۔ ہم نے یہ مقامات دیکھے۔ ان کو دیکھ کر عجیب عبرت حاصل ہوئی۔

پھر ہم احد پہاڑ کو دیکھنے گئے۔ یہاں دیگر آثار کے علاوہ وہ شق (غار) بدستور موجود ہے جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے شکست کے بعد پناہ لی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر غار میں داخل ہوا اور ان پتھروں پر دیر تک بیٹھا رہا جہاں حسب روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہونے کے بعد بیٹھے تھے۔ اس وقت طبیعت پر عجیب اثر ہوا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے تاریخ کا درمیانی وقفہ حذف ہو گیا ہے اور میں براہ راست رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پہنچ گیا ہوں۔

مدینہ منورہ میں ہمارا آخری پروگرام ۱۱ مارچ ۱۹۸۴ کو النادی الادبی میں تھا۔ فلسطینی نوجوان مصطفیٰ اشا ور ایک روز مجھ کو ایک کتاب کے سلسلے میں ایک دفتر میں لے گئے۔ مگر جب ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہاں کے ذمہ دار اعلیٰ (دکتور محمد ہاشم رشید) مجھ سے بخوبی واقف ہیں اور میری عربی مطبوعات پڑھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ النادی الادبی میں بھی ضرور میرا ایک پروگرام ہو۔

چنانچہ مشورہ کے بعد اس کی تاریخ ۱۱ مارچ کی شام طے ہوئی۔ النادی الادبی کے ذمہ داروں نے اخبار میں اس کا اعلان کر دیا۔ نیز حسب ذیل سرکلر مختلف تعلیم یافتہ افراد کے نام شخصی طور پر روانہ کیا گیا۔

المملكة العربية السعودية
الرئاسة العامة لرعاية الشباب
نادى المدينة المنورة الادبى

يتشرف نادى المدينة المنورة الادبى بدعوة حضرتكم للاشتراك فى الندوة المفتوحة التى سيقيمها النادى مع صاحب الفضيلة العلامة الداعية الاسلامى الكبير الشيخ وحيد الدين خان / مساء يوم الاحد الموافق ٩-١٠/٦/١٤٠٤ هـ بعد صلاة العشاء مباشرة على صالة المحاضرات فى مقر النادى بقباء

شاكرين

لكم حسن استجابتكم وتعاونكم مع النادى ،،،،،،،،،

رئيس نادى المدينة المنورة الادبى

محمد هاشم رشيد

۱۱ مارچ کی شام کو نشست ہوئی۔ النادی الادبی کے وسیع صحن میں کرسیاں بچھادی گئیں۔ علماء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے۔ مقالہ کا عنوان تھا:

الاسلام فی القرن العشرین

تلاوت قرآن کے بعد النادی الادبی کے رئیس دکتور محمد ہاشم رشید نے مفصل طور پر راقم الحروف کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک منفرد کتاب ہے اور میری دعا ہے کہ مصنف اسی انداز کی اور کتابیں لکھیں۔

اس کے بعد میں نے عربی مقالہ پڑھ کر سنایا۔ آخر میں اعلان کیا گیا کہ مقالہ سے متعلق کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہو تو وہ بتائیں۔ مقالہ نگار اس کا جواب دیں گے۔ مگر کسی نے کوئی سوال پیش نہیں کیا۔ البتہ دو آدمیوں نے مقالہ کے اعتراف پر تقریر کی۔ ایک صاحب نے کہا کہ مقالہ اتنا اعلیٰ اور اتنا مکمل تھا کہ ہم کوئی چیز نہیں پاتے کہ سوال کر سکیں۔ بس خدا سے دعا ہے کہ وہ مصنف کو صحت کے ساتھ بہت دن تک زندہ رکھے اور وہ بار بار مدینہ آئیں تاکہ ہم ان سے استفادہ کر سکیں۔

ہندستان واپس آتے ہوئے ہوائی جہاز میں ہم کو جو اخبارات مطالعہ کے لئے دئے گئے ان میں جدہ کا سعودی گزٹ (۲۱ مارچ) بھی تھا۔ اس اخبار کے مطالعہ کے دوران اس کے ایک صفحہ پر النادی الادبی کے اجتماع کی رپورٹ نظر سے گذری جو اخبار سے لے کر یہاں نقل کی جاتی ہے:

Indian Scholar Traces Glory of Islam

Sheikh Wahiduddin Khan, a famous Muslim scholar of India, recently delivered a lecture at the Madina Literary Club in which he reviewed the stages through which mankind passed till the appearance of the hight of Islam. Sheikh Wahiduddin also spoke about the great achievements realised by Islam and Muslims for the benefit of the entire human race since the mission of Prophet Muhammad till today. He was invited by the Islamic University, Madina. His lecture was entitled' "Islam and the Twentieth Century." Sheikh Wahiduddin is the author of the book *"Al -Islam Yatahadda"* which is currently being studied in various universities and scientific organisations. He is fluent in several languages, has written more than 30 books on Islam and has read more than 10,000 pages of books on Communism and scientific Socialism and has counter-acted them in more than 100 articles. He has worked as the Chief Editor of *Al-Risala* magazine, Delhi and was the President of the Islamic Centre for Research and Call in India. *(Al-Nadwa)*

Saudi Gazette (Jeddah) March 21, 1984

فلسطین کے ایک نوجوان احمد عزام سے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے اردن میں فلسطینی تحریک کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردن میں فلسطینی اتنے طاقت ور تھے کہ اسرائیل ان کے ڈر سے کانپنے لگا تھا (کانت اسرائیل ترجف خوفا)

میں نے پوچھا کہ شاہ حسین نے ابتداءً فلسطینیوں کی کافی مدد کی۔ پھر بعد کو وہ کیوں ان کے خلاف ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ فلسطینیوں کی قوت شاہ حسین کی قوت پر غالب آگئی تھی۔ (قوتنا تغلبت علیٰ قوۃ الملک حسین) اس بنا پر شاہ حسین نے ان کو مار کر اردن سے نکال دیا۔ کیسی عجیب بات ہے، اسرائیل اور شاہ حسین جس قوت سے کانپ رہے تھے وہی قوت اپنے کمزور حریفوں سے مغلوب ہو کر رہ گئی۔

فلسطینی تحریک کے موجودہ مرحلہ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ——— بدأ فی فلسطین المحتلۃ ظاھرۃ العودۃ الی الاسلام من جدید ویظھر ذالك من خلال الالتزام التام لمعظم الشباب الفلسطینیین ولذالك اریٰ بان المستقبل ھو مستقبل الجھاد۔ لان الناس قد اقتنعوا بان الثورات الوطنیۃ لن تحقق شیئ۔ وان الجھاد ھو الکفیل بتحریر فلسطین انشاء اللہ

یعنی مقبوضہ فلسطین میں اسلام کی طرف واپسی دوبارہ شروع ہوگئی ہے۔ اس کا اندازہ فلسطینی نوجوانوں کی اکثریت کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر میرا خیال ہے کہ فلسطین کا مستقبل جہاد کا مستقبل ہے۔ کیوں کہ لوگوں نے جان لیا ہے کہ وطنی جدوجہد سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اور جہاد ہی فلسطین کی آزادی کی ضمانت ہے انشاء اللہ۔

موجودہ زمانہ میں "دور اسلام کا آغاز" کی حقیقت بس وہی ہے جو اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔ لوگوں کا اصل مقصد بدستور قومی اور وطنی جدوجہد ہے۔ اس جدوجہد میں قومی اور وطنی نعرے لگانے سے کامیابی نہ ہو سکی۔ اب ان کی مایوسانہ نفسیات نے اسلامی نعرے میں اپنے لئے نئی پناہ تلاش کر لی ہے۔

کچھ قائدین اسلام سے ایک مخصوص گروہ کے بارے میں گفت گو تھی۔ انھوں نے اس گروہ کی ظلم و زیادتی کا ذکر کیا اور ان کے بارہ میں سخت الفاظ استعمال کئے۔ میں نے کہا کہ ——— اللہ انھیں ہدایت دے۔ انھوں نے غصہ میں آکر کہا: ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین۔ انّ اللہ لا یھدی القوم الظٰلمین

ہمارے پر جوش قائدین عموماً ایسے موقع پر اس طرح کی آیتیں پڑھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اپنی روش کی تائید میں وہ قرآن کی محکم دلیل پیش کر رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ سراسر غیر قرآنی بات ہے۔ ان آیات میں کافر اور ظالم سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جن کو ہم بطور خود کافر اور ظالم کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا کافر اور ظالم کے خانہ میں ڈالے۔ اور خدا ان لوگوں کو کافر اور ظالم کے خانہ میں ڈالتا ہے جن پر

اتمام حجت کی حد تک دعوت پہنچائی جائے، پھر بھی وہ کفر اور ظلم کی روش پر قائم رہیں۔

بعض اشخاص نے عالم اسلام کے دینی مدارس کی بابت سوال کیا۔ میں نے کہا کہ ہندستان میں اور دوسرے ملکوں میں جو اسلامی ادارے قائم ہیں وہ اپنے اعلان کردہ مقصد کے برعکس نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان اداروں کا نظام جدلی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ ان کے یہاں سارا زور اساسیات کے بجائے جزئیات پر ہے۔ ان میں سے کسی کا زور اعتقادی اختلافات پر ہے، کسی کا فقہی اختلافات پر اور کسی کا سیاسی اختلافات پر۔ اب چوں کہ جزئیات میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں کے ماحول میں جس کی تربیت ہوتی ہے وہ خلافیات کا ماہر ہو کر نکلتا ہے۔

ایک عرب عالم نے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھی۔ الدین فی مواجہۃ العلم پڑھی۔ الاسلام والعصر الحدیث پڑھی یہ سب کتابیں مجھے پسند آئیں۔ ان کتابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر رحمت کا دروازہ کھولا ہے۔ مگر اس کے بعد میں نے آپ کی کتاب "حکمۃ الدین" پڑھی تو وہ پسند نہیں آئی۔ اس میں آپ نے اخوان المسلمین کی سیاست پر تنقید کی ہے۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ دشمنان اسلام ہمارے اختلاف سے فائدہ اٹھانے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ہم کو صرف وہی باتیں کرنی چاہئیں جس سے اتفاق پیدا ہو۔

اس قسم کی باتیں اور بھی کئی بار سننے کو ملی ہیں۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ یہ کیسا عجیب مطالبہ ہے۔ جن جماعتوں پر میں نے تنقید کی ہے، وہ موجودہ زمانہ میں باہمی اختلاف کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ انھوں نے مسلم ملکوں میں مسلمانوں کو حکمراں اور غیر حکمراں کے دو طبقوں میں بانٹ رکھا ہے اور دونوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ جاری کر دیا ہے۔ میں تو زیادہ سے زیادہ صرف علمی تنقید کرتا ہوں۔ جب کہ دوسرے لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اختلاف سے گزر کر مسلمانوں کو باہمی تصادم میں ڈال دیا ہے۔ پھر بھی اختلاف پیدا کرنے کا الزام میرے اوپر ہے۔

تاہم عربوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود کسی آدمی سے محبت کر سکتے ہیں۔ عرب نوجوانوں کی بڑی تعداد اخوانی تحریک سے متاثر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں اخوانی تحریک کا ناقد ہوں۔ اس کے باوجود الاسلام یتحدی کی بنیاد پر وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ محمد ضیاء الدین ملا جبخی (حلب، شام) اخوانی نوجوان ہیں اور اخوانیوں کے بارہ میں میرے خیالات کو جانتے ہیں۔ مگر وہ نہایت احترام اور محبت کے ساتھ مجھ سے ملتے رہے۔ وہ دوسری بار آئے تو بتایا کہ میں نے شام میں اپنے والد سے ٹیلیفون پر بات کی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت میں خود نہیں آ سکتا۔ تم شیخ وحید الدین کو میرا اسلام کہو اور میری طرف سے ان کے ہاتھ کا بوسہ دو (فقبّل یدہ بالنیابۃ عنی)

۱۲ مارچ ۱۹۸۴ کو مسجد نبوی میں فجر کی نماز پڑھی۔ یہ مسجد نبوی میں ہماری آخری نماز تھی۔ نماز سے فارغ ہوکر جب میں باہر نکل رہا تھا تو بے اختیار میری زبان سے نکلا: خدایا یہ وہ مقام ہے جہاں تیرے پیغمبر نے نمازیں پڑھی ہیں۔ جہاں پیغمبر کے اصحاب کے قدم پڑے ہیں۔ جہاں ان لوگوں کی مجلسیں قائم ہوئی ہیں جن کو تونے جنت کی بشارت دی ہے۔ خدایا مجھے بھی اس مجلس میں شریک ہونے والوں میں شامل فرما۔ خدایا، جس طرح تو نے انھیں بخشا اسی طرح مجھے بھی اپنی رحمت سے بخش دے۔

۱۲ مارچ کی دوپہر کو ہم مدینہ سے ریاض پہنچے۔

سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے — "خدا تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے گا"۔ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں یہ خداوندی اطلاع مکی دور کے آخری سال نازل ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ آپؐ کی مظلومیت اور بے سروسامانی اپنی آخری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ حتیٰ کہ آپ کے مخالفین آپ کے قتل کی تدبیریں کرنے لگے تھے۔ آپ کو محمدؐ (تعریف کیا ہوا) کے بجائے مذمم (مذمت کیا ہوا) کہتے تھے۔

اس وقت خبر دی گئی کہ مخالفین اسلام اپنے وقتی اقتدار سے خوش نہ ہوں۔ محمدؐ بن عبداللہ کا معاملہ کوئی انسانی معاملہ نہیں۔ یہ تمام تر خدائی معاملہ ہے۔ خدا بہر حال اپنے منصوبہ کو پورا کرکے رہے گا، خواہ منکرین اس کے خلاف کتنی ہی کوششیں کر ڈالیں۔ نبیؐ عربی کے ساتھ یہ نہیں ہونا ہے کہ وہ گمنامی کے ساتھ اس دنیا سے چلے جائیں، جیسا کہ اکثر نبیوں کے ساتھ ہوا۔ خدا اپنے نبیؐ کو مکہ سے نکال کر یثرب لے جائے گا اور وہاں اس کے لئے مرکز فراہم کرے گا۔ اس کو اقتدار عطا فرمائے گا جس کے ذریعہ سے وہ باطل کو شکست دے گا۔ مخصوص خدائی مصالح کے تحت ان کو اس حد تک کامیاب بنانا ہے کہ وہ محمود خلائق ہو جائیں۔ ان کو مذمم کہنے والے بہت جلد اپنی زندگی ہی میں ان کو حقیقی معنوں میں محمد اور محمود بنتے ہوئے دیکھیں گے —— نبی عربی کے بارے میں خدا کا یہ منصوبہ مکمل طور پر پورا ہوا۔ حتیٰ کہ وہ اس قابل ہو سکے کہ دین خداوندی کی بنیاد پر ایک نئی تاریخ وجود میں لا سکیں۔

خدا کے رسولؐ جس طرح دنیا میں لوگوں کے درمیان محمود و ممدوح قرار پائے، اسی طرح میدان حشر میں بھی وہ لوگوں کے درمیان مقام محمود پر فائز ہوں گے۔ محمودیت کے اس آخری اور کامل اظہار کا نام مقام شفاعت ہے۔ دنیا میں آپ کے ذریعہ انسانیت کو ایک عظیم امتحان سے نجات ملی۔ آخرت میں بھی اللہ آپ کے وسیلہ سے لوگوں کو حشر کی ہولناک آزمائش سے نکالے گا اور بلاشبہ یہ ایک ایسا اعزاز ہوگا جو اولین و آخرین میں کسی کو حاصل نہیں۔

ایک پکار

اسلامی مرکز کی ابتدا نومبر ۱۹۷۰ میں ہوئی۔ ۱۹۷۶ میں ماہنامہ الرسالہ جاری ہوا۔ اور مکتبہ الرسالہ قائم ہوا۔ ان کا خاص مقصد اسلامی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کرنا ہے۔

اس مدت میں اللہ تعالیٰ نے اس مشن کو غیر معمولی کامیابی عطا فرمائی۔ الرسالہ آج سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اسلامی رسالہ ہے۔ ہماری مطبوعات سارے عالم اسلامی میں پھیل چکی ہیں۔ ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی اڈیشن فروری ۱۹۸۴ سے برابر ہر ماہ نکل رہا ہے۔ مکتبہ الرسالہ کی متعدد کتابیں عربی اور دوسری زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک کتاب (مذہب اور جدید چیلنج) مختلف عالمی یونی ورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔ دوسری کتاب (پیغمبر انقلاب) کو بین اقوامی مقابلہ سیرت میں اول انعام مل چکا ہے۔ حیدرآباد میں اسلامی مرکز کی ایک مکمل شاخ قائم ہو گئی ہے۔ وغیرہ

اب ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ الرسالہ کو عربی اور ہندی زبان میں بھی شائع کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ملک کی اہم علاقائی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی، تعلیمی و تربیتی ادارہ، مکمل اسلامی لائبریری، جدید پرنٹنگ پریس اور اس طرح کے دوسرے کام اب اسلامی مرکز کی فوری ضرورت بن چکے ہیں۔

اسلامی مرکز کے کام کو باقی رکھنا اور اس کو ترقی دینا کثیر وسائل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں ہم کو آپ کے خصوصی مالی تعاون کی شدید ضرورت ہے۔

اسلامی مرکز کا مقصد دور جدید میں اسلام کا احیاء اور ملت اسلامی کی تعمیر ہے۔ یہ وقت کا اہم ترین کام ہے۔ ہم کو پوری امید ہے کہ آپ اس سلسلہ میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور اپنے حلقۂ تعارف میں بھی لوگوں کو اس کار خیر کی طرف متوجہ کریں گے۔

واضح ہو کہ اسلامی مرکز میں مختلف نوعیت کے شعبے ہیں۔ ان کے لئے عام عطیات و تعاون کے علاوہ زکوٰۃ و صدقات کی مد کی رقمیں بھی بھیجی جا سکتی ہیں۔ رقم بھیجتے ہوئے براہ کرم اس کی مد کی صراحت فرمائیں۔

وحید الدین خاں ۔ صدر اسلامی مرکز
سی ۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۳

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd. D (DN) No. 532
Regd. R.N. No. 28822/76

July 1984
Issue No 92

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128